مطالعاتی مواد

مضمون　　　　اردو

جماعت　　　　بارھویں

ماھرین:

۱۔ شاکر شفیع　　لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول مجہ گنڈ سرینگر

۲۔ روف راحت　　لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول ہردشورہ بارہمولہ

۳۔ ڈاکٹر شکیل شفائی　　لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول ایم پی ایم ایل باغِ دلاور خان سرینگر

۴۔ میر ساجد رمضان　　لیکچرر ڈسٹرکٹ انسٹچوٹ آف ایجوکیشنل ٹریننگس اننت ناگ

۵، ڈاکٹر سید شبیر احمد　　لیکچرر ڈسٹرکٹ انسٹچوٹ آف ایجوکیشنل ٹریننگس بیروہ بڈگام

۶۔ ریاض خاکی　　لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول نارہ پورہ شوپیاں

نگراں :

رابعیہ نسیم مغل　　ریسرچ آفیسر ایس آئی سرینگر

معاون نگراں :

جاوید کرمانی　　ماسٹر ایس آئی ای سرینگر

تیار کردہ ؛

اسٹیٹ انسٹیچوٹ آف ایجوکیشن سرینگر کشمیر

زیر سرپرستی ؛

ڈیریکٹر اسکول ایجوکیشن کشمیر

موضوع: گذرا ھوا زمانہ
مصنف: سرسید احمد خان

تمہید

''گذرا ہوا زمانہ'' سرسید احمد خان کا لکھا ہوا مضمون ہے۔ یہ انشائیہ کے روپ میں لکھا گیا ایک تمثیلی مضمون ہے جس میں انسانی زندگی کے مختلف ادوار کو کرداروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ بچپن، جوانی اور بوڑھاپا جیسے زندگی کے ادوار ایک بچہ خواب میں گذارتا ہے حالانکہ یہ بچہ خواب میں اپنے آپ کو پچپن سال کا بوڑھا دیکھتا ہے۔ جس نے ساری عمر فضول کاموں میں برباد کی ہے اور آخر میں پچھتا تا ہے پھر ایک امید کی کرن اسکو نظر آتی ہے اور وہ اپنی ساری زندگی اچھے کاموں میں گذارنے کی سعی کرتا ہے۔ آخر پر سرسید قوم کے نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ قوم کی خدمت میں سارا وقت گذاروتا کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

تعارف

اس موضوع کو مختلف ذیلی عنوانات کے تحت پڑھا جاسکتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تمثیل کیا ہے؟

۲۔ انشائیہ کی تعریف

۳۔ ''گذرا ہوا زمانہ'' خلاصہ

۴۔ سرسید احمد خان حالاتِ زندگی اور ادبی کارنامے، علمی و عملی خدمات/ کارنامے۔

۵۔ علی گڈھ تحریک یا سرسید تحریک

۶۔ جانچ

۷۔ کتابیات

مقاصد:

۱۔ سبق ''گذرا ہوا زمانہ'' پڑھائے گا اور اس کی تفہیم کرائے گا۔

۲۔ سرسید کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں سے واقف کرائے گا۔

۳۔ تمثیل اور انشائیہ کی تعریف سمجھائے گا۔

۴۔ علی گڑھ تحریک کے بارے میں جانکاری فراہم کرائے گا۔

آموزشی ماحصل: Learning outcomes

۱۔ بچے سبق ''گذرا ہوا زمانہ'' پڑھتے ہیں اور تفہیم عبارت بھی کرتے ہیں۔

۲۔ بچے سرسید کے حالاتِ زندگی سے واقف ہیں وہ سرسید کے ادبی، علمی و عملی کارناموں پر بات کرتے ہیں۔

۳۔ وہ تمثیل اور انشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

تمثیل

جب کبھی بے جان چیزوں کو زندہ انسانوں کی صورت دے کر ان سے باتیں کروائی جائے یا پھر ان کو انسانوں کی صورت میں مثال بنا کر پیش کیا جائے۔ تمثیل کہلاتا ہے۔

انشائیہ

انشائیہ کی صنف اردو میں انگریزی کی دین ہے۔ انگریزی میں اسے ''ایسے'' کہتے ہیں۔ انشائیہ وہ تحریر ہے جس میں کسی اہم یا غیر اہم واقعے، کسی خیال، کسی جذبے یا محض کسی لمحاتی کیفیت کو پر لطف انداز میں پیش کر دیا گیا ہو۔ ترتیب، غور و فکر اور سنجیدگی وہ چیزیں ہیں جن کو یہ صنف برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ ہلکا پھلکا خیال اور نرم و نازک ظرافت آمیز اظہار اسے زیب دیتا ہے۔ انشائیہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی کوئی شرط نہیں۔ کوئی اصول نہیں۔ جو کچھ کہو اسکو پڑھ کر قاری خوش ہو جائے۔ اسی لئے اس صنف کو انشائیہ نگار کی ذہنی ترنگ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ اس کے لئے ضروری نہیں۔ انشائیہ نگار کے لئے لازمی ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرنے کا گُر جانتا ہو۔ انشائیہ میں علم و حکمت کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کے، بجائے زندگی کے عام تجربے کو شگفتگی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رہے۔

اردو میں انشائیہ کی مستحکم روایت موجود ہے۔ جن میں سر سید احمد خان (خوشامد) محمد حسین آزاد (نیرنگِ خیال) حسن نظامی (جھینگر کا جنازہ) مرزا فرحت اللہ بیگ (ایک وصیت کی تعمیل) رشید احمد صدیقی (ارہر کا کھیت) پطرس بخاری (کتّے) بہت ہی مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ادیبوں نے اس میدان میں کارنامے انجام دیئے، ان میں وزیر آغا، یوسف ناظم، شوکت تھانوی، شفیقہ فرحت، مجتبیٰ حسین اور مرزا محمد زماں آزردہ کامیاب انشائیہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔

سر سید احمد خان

حالاتِ زندگی:

سر سید احمد خان انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے رہنما گذرے ہیں۔ سر سید کی پیدائش 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں ہوئی۔ والد کا نام سید متقی اور والدہ خواجہ میر درد کی پوتی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت میں اُن کی والدہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ ابتداء میں انہوں نے گھر میں ہی عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی پھر دہلی کے کئی علماء اور شعراء سے بھی فیض اُٹھایا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو کر مضامین لکھنے لگے۔ چار سال تک شاعری کی اور آہی تخلص اختیار کیا۔ اکیس سال کی عمر میں انہوں نے سرشتہ داری (Head Clerck) سے شروعات کی اور ترقی کرتے کرتے صدرِ امین (Judge) کے عہدے تک پہنچ گئے۔ مغربی علوم کے حصول کی خاطر 1861ء میں مراد آباد اور 1862ء میں غازی پور میں انگریزی سکول قائم کئے۔ 1864ء کو غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا۔ 1869ء میں انگلستان چلے گئے تا کہ انگریزی نظامِ تعلیم، طرزِ معاشرت اور اخلاقی و سماجی نظام کا مشاہدہ کر سکیں۔ 1877ء میں اپنے عہدے سے فارغ ہو کر اپنا تمام وقت عوامی خدمات ہی میں صرف کرنے لگے۔ اسی سال محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی اور اپنی وفات 27 مارچ 1898ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

سر سید کے علمی کارنامے:

سر سید نے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے انگلستان کا دور دراز سفر کیا۔ وہاں کے تعلیمی اداروں کا بغور جائزہ لیا، اسی طرز پر ہندوستان میں ایک کالج ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' قائم کیا۔ جو بعد میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہوا۔ ساتھ ہی ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جس میں اصلاحی اور اخلاقی مضامین سادہ اور سہل زبان میں شائع ہوتے تھے۔ جس سے اردو نثر کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مدرسۃ العلوم، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور سائنٹفک سوسائٹی جیسے اداروں کا قیام عمل میں لایا۔

سرسید کے ادبی کارنامے:

سرسید مفکر اور مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے دینیات، تاریخ اور اخلاقیات پر مستقل کتابیں لکھیں، جن میں خطباتِ احمدیہ، آثار الصنادید، جلاء القلوب، تبیین الکلام بہت ہی مشہور ہیں۔ سرسید احمد خان نے ملازمت کے دوران ہی تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا تھا۔ 1857ء کا سارا ہنگامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس زمانے کی ایک یادگار تصنیف ''تاریخ سرکشی بجنور'' ہے۔ پھر انہوں نے ایک اور کتاب لکھ کر یہ ثابت کیا کہ سرکار کی غلط پالیسی ہی اس بغاوت کیلئے ذمہ دار ہے۔ اس کتاب کا نام ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' ہے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ بغاوت کے بعد مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا گیا ہے تو انہوں نے ''دی لائل محمڈنز آف انڈیا'' لکھ کر یہ طوفان روکنے کی کوشش کی۔ غازی پور کے قیام کے دوران اپنے تعمیری مقاصد کیلئے وہاں ایک سوسائٹی ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے نام سے قائم کی۔ جس کا مقصد ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کو مغرب کی ترقی سے واقف کرانا تھا۔ اس سوسائٹی سے کئی رسالے بھی شائع ہوتے رہے اور سائنس پر لیکچر دلائے گئے۔

سرسید کی مضمون نگاری:

اُردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کی بنیاد سرسید کے ہاتھوں پڑی۔ سرسید نے انگریزی زبان کے نامور مضمون نگاروں ایڈیسن اور اسٹیل کے طرز کو اپناتے ہوئے کچھ ایسے بھی مضامین لکھے جن کو انگریزی مضامین کا ترجمہ یا چربہ سمجھنا چاہیے۔ سرسید کے مضامین تین طرح کے ہیں۔ اول: خالص مذہبی اور دینی۔ دوم: سیاسی مضامین۔ سوم: اصلاحِ اخلاق و معاشرت سے متعلق۔ ان مضامین میں ان کا اختصار قدرِ مشترک ہے، جو ایک باقاعدہ مضمون کا بنیادی وصف ہے۔ اس کے علاوہ سرسید کے مضامین میں بے حد سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اکثر مضامین میں ان کی حیثیت معلم اخلاق کی ہے ادیب کی نہیں۔ سرسید کے مضامین میں ظرافت کے کچھ انداز ضرور پائے جاتے ہیں۔

سرسید کی نثر نگاری/طرزِ تحریر/اسلوب:

سرسید احمد خان کو جدید اردو نثر کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی عبارت میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریر میں الفاظ سیدھے سادھے اور روزمرہ کے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سیدھے، سچے، مناسب اور آسان انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو بناوٹ، فضول عبارت آرائی اور مبالغہ کے انداز سے پاک کر دیا۔ ان کی تحریر کی سادگی پڑھنے والے کے دل کو چھو جاتی ہے اور اس کا اثر بڑی دیر تک قائم رہتا ہے۔ انہوں نے اُردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک:

آغاز و ارتقاء

سرسید احمد خان ایک فردِ واحد کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ وہ بذاتِ خود ایک دبستانِ نثر یا تحریک ہیں جسے علی گڑھ تحریک سے جانا جاتا ہے۔ علی گڑھ تحریک نہ صرف سیاسی، علمی اور تعلیمی لحاظ سے اہم ہے بلکہ ادبی، معنوی، موضوعاتی اور نظریاتی لحاظ سے اس کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ سرسید کی جہاں دیدہ اور ہمہ جہت شخصیت پر یہ شعر صادق آتا ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد سرسید نے محسوس کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی اور اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے جدید علوم کو عام کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء میں اُنہوں نے مراد آباد اور غازی پور میں انگریزی سکول قائم کئے۔ اس کے علاوہ ایک

سائنٹفک سوسائٹی بھی قائم کی۔ ۱۸۶۹ء میں انگلستان چلے گئے۔اور واپسی پر انگریزی نظام تعلیم،طرز معاشرت اور اخلاقی وسماجی نظام کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک کالج قائم کیا۔ جو ترقی کرتے کرتے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔اس کالج کی بنیاد ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن کے ہاتھوں ہوئی۔سرسید نے مرتے دم تک اس کالج کے لئے کام کیا۔سرسید اور انکے رفقاء نے باضابطہ ایک تحریک شروع کی جو علی گڈھ تحریک یا سرسید تحریک کہلاتی ہے اس تحریک کا بنیادی مقصد علمی،ادبی،سیاسی،معاشی،اخلاقی خوشحالی اور ترقی تھا۔اس تحریک سے ہندوستانی مسلمانوں اور دیگر اقوام کو کافی فائدہ پہنچا۔اُردو ادب میں ترقی پسندر جحانات کو تقویت ملی اور جدید رجحانات سامنے آئے۔ادب میں مقصدیت پیدا ہوگئی۔مبالغہ آرائی اور جھوٹ سے پرہیز کیا گیا۔مولانا حالؔی نے اُردو شاعری کے لئے مقدمہ شعروشاعری میں لوازمات اور پیمانے فراہم کئے۔مذہب،سیاست،تعلیم،معاشرت،اقتصادیات شاعری اور نثر دونوں میں شامل ہوئے۔جدیدت کا آغاز بھی یہی سے ہوا۔

مولانا حالی نے مسدس لکھ کر قوم کو ترقی کے لئے آمادہ کیا۔عریانیت،فحش گوئی اور باقی خرابیاں شاعری سے دور کردی گئیں۔اس تحریک نے ہر میدان میں ترقی کی اور سوئے ہوئے لوگوں کو جگایا۔اس تحریک نے مردوں میں جان بھردی۔مسلمانوں کو نئے تقاضوں اور جدید راہوں پر چلنے کا سلیقہ سکھایا۔

سرسید کے رفقاء:

اگرچہ سرسید نے علی گڑھ تحریک اکیلے ہی شروع کی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور لوگ اس کے جڑتے گئے اور کاروان بڑھتا گیا۔سرسید کے شامل ہوکر جن لوگوں نے عملی طور پر اس تحریک کو پروان چڑھایا اُن میں مولانا الطاف حسین حالؔی،علامہ شبلی نعمانؔی،محمد حسین آزادؔ،نذیر احمد،نواب محسن الملک اور چراغ دہلوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔حالانکہ کچھ لوگ سرسید کی مخالفت بھی کرتے تھے،جن اکبر آلہ آبادی پیش پیش تھے مگر سرسید کی وفات پر انہوں نے اُن کے کارناموں کا ان الفاظ میں اعتراف کیا

ہماری باتیں ہی باتیں تھی سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

سرسید کے عملی کارنامے:

سرسید احمد خان نے نہ صرف اپنی قائدانہ صلاحیت سے عوامی خدمات انجام دیں بلکہ اپنی تحریر سے بھی عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے۔وہ علم اور عمل کے آدمی تھے۔عملی میدان میں انہوں نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی مراد آباد میں ایک یتیم خانہ اور ایک اسپتال اور علی گڑھ میں اورینٹل کالج کا قیام وغیرہ جیسے عظیم کارنامے انجام دیئے۔اورینٹل کالج آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے علم کے نور سے ہندوستانی عوام کو منور کررہا ہے۔

رسالہ ''تہذیب الاخلاق'':

انگلستان کے قیام کے دوران سرسید احمد خان نے وہاں کے تہذیب وتمدن اور علم وعمل کا گہرا مطالعہ کیا اور انگریز قوم کی ترقی کے پیچھے کارفرما عناصر پر بھی کافی غور کیا۔جب انگلستان کی حالت ہندوستان کی طرح خراب وخستہ تھی تو وہاں تہذیب اور اخلاق کے دو پیغمبروں ایڈیسن اور اسٹیل نے سوشل رفارمر کی حیثیت سے یکے بعد دیگرے ''ٹیٹلر'' اور ''اسپکٹیٹر'' دو رسالے جاری کیے۔انہوں نے انگلستان کی کایا پلٹ دی اور سماجی خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔سرسید نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان لوٹ کر ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کریں گے جس سے ہندوستانی قوم کی ترقی کی راہیں ہموار کی جاسکیں۔ہندوستان آتے ہی انہوں نے یہ رسالہ جاری کیا اور رسالے میں مذہبی،اخلاقی،معاشرتی،علمی،ادبی اور سائنسی مضامین شائع کروائے۔ان مضامین کا ہندوستانی عوام پر بڑا اچھا اثر پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے سرسید کی پیروی میں بہت سارے عالم فاضل آگے بڑھنے لگے۔اس رسالے سے ایک طرف اصلاحی کام ہوتا رہا اور دوسری طرف اردو نثر کو بھی فائدہ ہوتا رہا۔اردو میں سلیس رواں اور شگفتہ تحریر کی شروعات اور ترویج میں اس رسالے کا اہم کردار ہے۔

مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' میں سرسید کا پیغام

سرسید احمد خان ایک مصلح قوم رہے ہیں۔ سماجی اصلاح اُن کی زندگی کا خاص مقصد رہا ہے۔ مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' میں بھی اُن کا اصلاحی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ تمثیلی انداز میں ایک لڑکے کے خواب کو بیان کرنے میں دراصل اُن کا یہی مقصد اور پیغام ہے کہ وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے ایک عظیم نعمت ہے۔ وقت کا اچھا اور صحیح استعمال ہی دانشمندی ہے۔ کیونکہ وقت ایک ایسی شئے ہے جو ہاتھ سے نکل جانے کے بعد واپس نہیں آتا ہے۔

سرسید چاہتے ہیں کہ وطن میں رہنے والے لوگ ہمیشہ وقت کا صحیح استعمال کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں پیش پیش رہیں۔ لوگوں کے نیک اعمال کسی ذاتی غرض یا مقصد کی تکمیل کے لئے نہیں ہونے چاہیے بلکہ ہر وقت قوم کی ترقی اور بہبود کے لئے عملاً کوشش کرنی چاہیے۔ اگر انسان وقت سے پہلے راہِ راست پر آ کر خدا پرستی، قومی بھلائی اور انسان پروری کے لئے عملاً تیار نہیں ہوتا ہے تو اس کا انجام بھی اُسی بوڑھے کی طرح ہوگا جو زندگی کے آخری دنوں میں اپنے گزرے ہوئے وقت پر پشیمان ہو کر افسوس کرتے ہوئے چیخنے چلانے لگتا ہے اور سوائے شرمندگی کے اُسے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

سوال: بوڑھے نے اپنی گزری ہوئی زندگی کے مندرجہ ذیل ادوار کے بارے میں جو کچھ دیکھا اور یاد کیا وہ سب اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے۔ لڑکپن۔ جوانی۔ ادھیڑ پن

جواب: سرسید کے لکھے ہوئے انشائیے ''گزرا ہوا زمانہ'' کا مرکزی کردار بوڑھا اپنے ماضی پر افسوس کرتے ہوئے اپنے لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ پن کو یاد کر رہا ہے۔ اُسے اپنا لڑکپن یاد آتا ہے جب وہ روپیہ پیسوں کے برعکس مٹھایاں پسند کرتا تھا۔ گھر کے سارے افراد اُسے پیار کرتے تھے۔ اُسے اسکول جانا اور اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنا کودنا یاد آتا ہے اور افسوس کرتے ہوئے وہ چلانے لگتا ہے۔ جوانی میں تکبر کی وجہ سے اُس کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا ہوا تھا کہ ماں باپ کی نصیحت، نیکی اور خدا پرستی کی باتیں بھی اُسے متاثر نہیں کرتی تھیں۔ اس دور کو یاد کر کے وہ تأسف کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔

اُدھیڑ پن میں اُس نے بہت سارے نیک اعمال کیے تھے۔ اس دور میں وہ خدا کی عبادت اور دوسرے ضروری فرائض بھی انجام دیتا تھا محتاجوں کی امداد بھی کی تھی۔ مسجدیں تعمیر کروائی تھیں۔ لوگوں کے آرام و آسائش کے لئے کنویں بنوائے تھے۔ خدا کے نیک بندوں کی خدمت بھی کی تھی لیکن اس کے سارے اعمال ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے تھے۔ جن سے اُسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکا۔ الغرض بوڑھا ان تینوں ادوار کو گزار چکا تھا مگر سوائے شرمندگی اور افسوس کے اُسے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اسلئے وہ پریشانی کے عالم میں چیخنے چلانے لگتا ہے۔

جانچ:

مندرجہ ذیل اقتباس کو غور سے پڑھو اور آخر پر دئے گئے سوالات کے جوابات لکھو؟

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی غرض سے کئے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

۱۔ بوڑھے کی عمر کیا تھی؟

۲۔ بوڑھے نے نیک کام کس غرض سے کئے تھے؟

۳۔ خدا کو رشوت دینے کی غرض سے کون سے کام کئے تھے؟

۴۔ پچپن برس کی عمر میں کون سا کام نہیں کیا تھا۔

سوال: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھو۔

۱۔ سرسید کے حالات زندگی لکھو۔

۲۔ سرسید کے عملی و علمی کارناموں پر نوٹ لکھو۔

۳۔ ''گذرا ہوا زمانہ'' میں زندگی کے کن ادوار کا ذکر ہے؟

۴۔ سرسید احمد خان نے اس سبق میں کیا پیغام دیا ہے؟

مختصر سوالات:

۱۔ ''گذرا ہوا زمانہ'' میں بوڑھے کی عمر کیا تھی؟

۲۔ بوڑھا اپنی جوانی کو کیسے یاد کرتا ہے؟

۳۔ سرسید قوم کے نوجوانوں کو کیا پیغام دیتا ہے؟

۴۔ ''گذرا ہوا زمانہ'' میں دولہن کون تھی؟

۵۔ سرسید کے تین رفقاء کے نام لکھو۔

۶۔ سرسید کی دو تصانیف کے نام لکھو۔

سوال: خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجیے۔

۱۔ گذرا ہوا زمانہ .... نے لکھا ہے۔ (حالی، سرسید، پریم چند)

۲۔ بوڑھے کی عمر .... تھی۔ (پچپن برس، بیس سال، چالیس برس)

۳۔ سرسید نے .... کتاب لکھی۔ (آثارالصنادید/ مقدمہ شعروشاعری/ الفاروق)

۴۔ سرسید احمد خان .... میں پیدا ہوئے۔ (۱۸۱۷ء/ ۱۸۱۶ء/ ۱۸۹۸ء)

۵۔ سرسید احمد خان کا انتقال .... میں ہوا۔ (۱۸۱۷ء/ ۱۸۱۷ء/ ۱۸۹۸ء)

۶۔ علی گڈھ کالج کب قائم ہوا۔ (۱۸۶۹ء/ ۱۸۸۱ء/ ۱۸۷۷ء)

۷۔ سرسید احمد خان ۱۸۶۹ء میں کہاں گئے۔ (ہندوستان/ امریکہ/ انگلستان)

کتابیات:

۱۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء — سید عبداللہ — ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ ص ۵۲

۲۔ وجہی سے عبداللہ تک — ڈاکٹر سید عبداللہ — دارالاشاعت معلیٰ

۳۔ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر سنبل نگار

۴۔ تاریخِ ادب اردو — نورالحسن نقوی

منشی پریم چند **گلی ڈنڈا**

تمہید

کہانی کس کو پسند نہیں۔قدیم زمانے میں کہانیوں کا بہت رواج تھا لیکن کہانیاں لمبی ہوتی تھیں انہیں داستان کہتے تھے داستان کا سلسلہ مہینوں چلا۔ جب زندگی کی رفتار میں سُرعت آ گئی تو داستان کی جگہ ناول نے لی۔داستان کے مقابلے میں ناول مختصر ہوتا ہے اور زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔لیکن پھر عالمی حالات نے وہ کروٹ لی کہ انسان کیلئے وقت تنگ ہوتا گیا۔اسی لئے ناول کے ساتھ ساتھ مختصر کہانی کا رواج چل پڑا۔مختصر کہانیاں ہندوستان میں پہلے بھی لکھی اور پڑھی جاتی تھیں۔لیکن بیسویں صدی میں اس نے مغربی ادبی کے زیرِ اثر ایک نیا قالب اختیار کیا جسے افسانہ کہا گیا۔ذیل میں افسانے کے بارے میں چند ضروری باتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

مقاصد :

اس سبق کو پڑھنے کے درجِ ذیل مقاصد ہونگے

۱۔ طلاب اردو افسانہ کی تکنیک کو جانیں۔

۲۔ طالبِ علم اردو افسانے کی روایت سے روشناس ہو۔

۳۔ طالبِ علم پریم چند اور دوسرے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو پڑھیں۔

آموزشی ماحصل :

۱۔ طالبِ علم اردو افسانے کے فن پر بات کرتے ہیں۔

۲۔ طلاب اردو افسانے کے آغاز وارتقاء پر بات کرتے ہیں۔

۳۔ طلاب افسانے پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔

۴۔ طلاب افسانوں کا مختصر تجزیہ کرتے ہیں۔

۵۔ طالبِ علم پریم چند اور دوسرے افسانہ نگاروں کی حیات اور خدمات پر گفتگو کرتے ہیں۔

افسانے کا تعارف:

افسانے کی مختصر تعریف یہ ہوسکتی ہے ’’کسی وقوعہ کا ایسا دلچسپ بیان کہ قاری پوری دلجمعی کے ساتھ پڑھ سکے۔‘‘ اُردو میں افسانہ شارٹ اسٹوری (short story) کا مترادف ہے یہ صنفِ جدید مغربی ادب کی دین ہے۔لہٰذا پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ خود مغرب میں اس کی کیا تعریف ہے۔دی اسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں شارٹ اسٹوری کی یہ تعریف کی گئی ہے:

" short story, brief fictional process narrative that is shorter than a novel and that usually deals with only a few characters. The short story is usually concerned with a single effect conveyed is one or few significant episodes or scenes....."

’’شارٹ اسٹوری ایک قصصی بیانہ ہے جو ناول سے چھوٹا ہوتا ہے جس میں عموماً چند ہی کردار ہوتے ہیں۔شارٹ اسٹوری کا تعلق عموماً ایک ہی واقعہ سے ہوتا ہے جس کو ایک یا چند قسطوں یا منظروں میں پیش کیا جاتا ہے۔۔۔۔‘‘

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کیلئے ناول سے کم ضخامت کا ہونا ضروری ہے اور اس میں ایک یا چند باتوں کو وحدت تأثر کے ساتھ بیان

کرنالازمی ہے۔ برصغیر میں افسانہ بیسویں صدی کی ابتداء میں آیا۔ممتاز شریں نے لکھا ہے:

''افسانہ مغرب میں بھی سب سے نئی اور کم عمرصنفہے ۔ ہمارے ہاں افسانے کی پیدائش ہی اُس وقت ہوئی جب ہامرے ادیب مغربی ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے لگےاوراس سے مستفید ہونے لگے۔''

افسانہ تحریری شکل میں ہوتا ہے۔افسانہ نگار بالکل نئی کہانی کوتحریر کے پیرائے میں بیان کرتا ہے تاکہ قاری کی توجہ کا حصول ممکن ہواور قاری کوتنہائی میں زیادہ گہرائی سے سوچنے اورمحسوس کرنے کا موقعہ فراہم ہوسکے۔

دوسرےلفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ اپنی ترقی یافتہ شکل میں وہ بیانیہ تحریر ہے جس میں فن کوملحوظ رکھ کرزندگی کےتعلق سے کسی ایک واقعے، حادثے، جذبےکومختصراًاس طرح بیان کیا جائے کہ قاری پورے ذہنی لگاؤ کے ساتھ اسے پڑھ سکےاورابتدائی تأثرانجام کوپہنچ کراپنا ایک مکمل اوربھرپورنقش قاری کے ذہن پرقائم کرجائے۔

افسانہ اگرچہ مغربی صنف ہے تاہم اس نے ہندوستانی رنگ وروپ اس طرح اختیار کیا ہے کہ یہ امتیاز کرنا نہایت مشکل ہے کہ یہ غیرملکی صنفِ ادب ہے۔اس نے ہندوستان میں پروان چڑھنے والی کہانیوں اورداستانوں کواپنے اندرجذب کیا ہے۔اس نے ملکی معاشرت،تہذیب اورقومی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

افسانہ زندگی سے براہِ راست متعلق ہوتا ہےاورجیسے جیسے زندگی میں تبدیلی رونماہوتی ہے اسی پیکر میں افسانہ بھی ڈھلتا جاتا ہے۔افسانے کی روح وحدتِ تأثر ہے۔یہی افسانہ نگار کا فنی نصب العین بھی ہوتا ہے۔افسانے کےتشکیلی لوازم سریّت ،تجسس،نُدرت، جدت، ماحول، قاری کواپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اس کی دلچسپی اول تا آخر برقرار رہتی ہے اورقاری کا ذہن اُس وحدتِ تأثرکوقبول کرلیتا ہے جوافسانہ کی تخلیق کا سبب ہوا ہے۔دیگراصناف کی طرح افسانہ بھی مختلف اجزاء یا عناصر سے مل کروجود میں آتا ہے۔اس کےتشکیلی عناصر میں پلاٹ،کردار، ماحول،فضا کے علاوہ وحدت تأثر،موضوع اور اسلوب کواہمیت حاصل ہے۔

پلاٹ: افسانے میں واقعات،مشاہدات اورحادثات کی فنی تعمیر دراصل پلاٹ کی تشکیل کی وساطت سے ہوتی ہے۔ پلاٹ جس قدرمربوط،متجسس اورمتناسب ہوگا افسانہ اتنا ہی دلچسپ اورمعیاری ہوگا۔

کردار: افسانے میں اشخاص قصہ کےحرکات وسکنات کی عکاسی کا نام کردارسازی ہے۔اگرکہانی کے کردارافسانے سے غائب ہوں توافسانے کی تکمیل ممکن نہیں۔

ماحول اورفضا: ماحول اورفضا بھی افسانے کےضروری عناصرقرار دیئے جاتے ہیں۔ یہ پلاٹ اورکردار کی ایسی درمیانی کڑیاں ہیں جوتمام واقعات کے تانوں بانوں کویکجا کرتی ہیں۔ ماحول کےتحت کہانی کے گردوپیش کے مناظر،مقام کی جغرافیائی خصوصیت اورمکان کے سازوسامان آتے ہیں۔فضا اُس تأثرکوکہیں گے جوماحول کی تصویرکشی سے دل ودماغ میں پیدا ہوتا ہے۔مثال کےطور پرقبرستان کی ویران اورتاریک رات کا منظرماحول میں شمار ہوتا ہے۔لیکن اس کے تصور سے دل ودماغ پرجوخوف اوراُداسی طاری ہوتی ہے اُسے فضا کہیں گے۔

وحدتِ تأثر: افسانہ نگار جوکچھ کہنا چاہتا ہے وہ پورے تأثرکےساتھ افسانے میں نظرآئے اورقاری اس کواسی شدت سے محسوس کرے۔

موضوع: ابتدائی دورکےافسانوں میں موضوع کوخاص اہمیت حاصل تھی۔ پریم چند، راشدالخیری،سدرش،اعظم کریوی،علی عباس حسینی،اوپندرناتھ اشک وغیرہ اپنے افسانوں کیلئے ایسے موضوعات منتخب کرتے تھےجن کاتعلق جیتی جاگتی دنیااوربےبس ومظلوم انسانوں سے ہوتا تھا۔رومانوی افسانہ نگاروں جیسے سجادحیدریلدرم،نیازفتح پوری وغیرہ سےنرم وگرم اورگدازبانہوں کےلمس کےتاثرات سےاپنے موضوعات سجائے۔

اسلوب: پلاٹ کی فنی ترتیب ہو، کردار نگاری ہو، مناظر کی مصوری ہو یا فضا کی تاثیر ہو حُسنِ بیان کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر دل موہ لینے والی تحریر نہ ہو تو افسانہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام ہوگا۔

آج افسانہ اپنی قدیم ہیئت سے کافی بدل چکا ہے۔ جدید افسانہ اپنے ماضی سے بہت کچھ مختلف ہے اور نئے تجربوں سے دو چار ہے۔

بقول ممتاز شیریں:

''آج کا افسانہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل آیا ہے۔ ساری پابندیوں کو توڑ کر زندگی کی ساری وسعتوں اور پیچیدگیوں کو اپنے آپ میں سمو لینا چاہتا ہے۔ اب ایسے افسانے بھی ہیں جن میں پلاٹ نہیں ہوتا۔ جن کی کوئی متناسب اور مکمل شکل نہیں ہوتی۔ وقت اور مقام کا تسلسل نہیں ہوتا۔''

پریم چند

حالاتِ زندگی:

پریم چند بنارس سے چار پانچ میل دور لمہی نام کا ایک چھوٹے سے گاؤں میں 31 جولائی 1880ء کو منشی عجائب لال کے گھر میں پیدا ہوئے۔ جس کا نام دھنپت رائے رکھا گیا اور جو بڑا ہو کر ہندستانی ادب کی دنیا میں پہلے نواب رائے اور پھر پریم چند کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُنھوں نے سب سے پہلے ایک مسلمان مولوی سے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ دھنپت رائے کے والد ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ جب اُن کا گورکھ پور تبادلہ ہوا تو وہاں ایک مشن اسکول کی چھٹی جماعت میں اُن کا نام لکھا دیا گیا۔

1899ء اُنھوں نے میٹرک کا امتحان دوسرے درجے میں پاس کر لیا۔ اِس کے بعد وہ پندرہ روپے ماہانہ پر ایک اسکول میں مدرّس ہو گئے۔ 1902ء میں وہ ٹریننگ کے لیے الٰہ آباد کے ایک کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر اُنھیں کتابیں لکھنے کا شوق ہوا اور اُن کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' بنارس کے ایک رسالے میں شائع ہونا شروع ہوا۔ مئی 1905ء میں پریم چند کا تبادلہ کانپور ہو گیا۔ کانپور میں اُردو کے مشہور رسالے ''زمانہ'' کے ایڈیٹر دیارام نگم سے اُن کی دوستی ہو گئی اور وہ پابندی کے ساتھ ''زمانہ'' میں لکھنے لگے۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''سوزِ وطن'' نواب رائے کے فرضی نام سے 1908ء میں شائع ہوا جس کی کاپیاں انگریزی سرکار نے ضبط کر کے نذرِ آتش کر دیں۔ 1921ء تک پریم چند ہندی اور اردو کے ادیب کی حیثیت سے سارے ملک میں مشہور ہو چکے تھے۔ کئی سال تک لکھنو میں ایک ہندی رسالہ ''ہنس'' جاری کیا۔ 8/ اکتوبر 1936ء میں اُردو کا یہ عظیم تخلیق کار اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ادبی کارنامے:

پریم چند نے 1908ء میں نواب رائے کے فرضی نام سے پانچ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ ''سوزِ وطن'' شائع کیا۔ اُنھوں نے ناول اور افسانوں کے علاوہ ڈرامے اور انشائیے بھی لکھے۔ کئی مغربی شاہکاروں کے ترجمے بھی کیے لیکن افسانہ اور ناول میں اُنہیں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ پریم پچیسی، پریم چالیسی، زادِ راہ اور واردات اُنکے افسانوں کے نمائندہ مجموعے ہیں۔ اُنھوں نے ایک ہندی رسالہ ''مریادا'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ 1930ء میں انہوں نے اپنا ایک ہندی رسالہ ''ہنس'' جاری کیا۔ ''کربلا'' اُن کا لکھا ہوا مشہور ڈراما ہے۔ چوگانِ ہستی، بیوہ، نرملا، گئودان، میدانِ عمل، گوشۂ عافیت اور غبن اُن کے بہترین ناول گنے جاتے ہیں۔

پریم چند کی افسانہ نگاری:

پریم چند کے ناول اور افسانے اپنی بے مثال حقیقت نگاری کی وجہ سے اُردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے کسانوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور اسے بڑی سچائی سے پیش کیا۔ اُن کے افسانوں کا مخزن دیہات ہے۔ ہندوستانی کسان اپنی پوری شخصیت کے ساتھ پریم چند کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ اس کے اندر اس کی کمزوریاں بھی ہیں اور طاقت بھی، ہر چیز وہ جیسا دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کامیاب

کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت واصلیت، واقعات کی بناوٹ یا رنگینی میں پوشیدہ نہیں ہونے پاتی۔ وہ قصے کو اپنے فطری راستے پر چلنے دیتے ہیں اور اسے بلا وجہ پیچیدہ نہیں بناتے۔ پریم چند ہر بات کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کی نگاہ سے نہیں بچنے پائیں۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا ایک اور پہلو اصلاحِ معاشرت ہے۔ وہ ہندوستانی سماج کی برائیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر کہانیوں میں وہ نیکی کی جیت اور بدی کی ہار دکھاتے ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں، مسلمانوں، امیروں، غریبوں، شریفوں، اونچی ذات والوں اور نیچی ذات والوں سب ہی کے بارے میں کہانیاں لکھی ہیں۔

پریم چند کا طرزِ تحریر/اسلوب/نثر نگاری:

پریم چند کی نثر سادہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ انہیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ ہندی اور فارسی زبانوں کے الفاظ موقع ومحل کی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے اندازِ بیان سے اپنے قصے کو اتنا دلکش بنا دیتے ہیں کہ قاری ان کی تحریر کو پڑھتے وقت مست ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریر میں بناوٹ بالکل نہیں ہوتی ہے۔ سیدھی سچی بات، سادہ اور صاف رواں اور زوردار عبارت میں ہوتی ہے۔ جس کی خوبی اور اثر کو ان کی ہلکی ظرافت اور ان کے دل کی سچائی اور درد بڑھا دیتے ہیں۔ پریم چند نے اُردو کے افسانوی ادب کو ایک جاندار اور شگفتہ اسلوب عطا کیا۔ اُردو نثری ادب میں منشی پریم چند کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

کھانی ''گلی ڈنڈا'' کا خلاصہ:

منشی پریم چند کی کہانیوں میں ''گلی ڈنڈا'' ایک مشہور کہانی ہے جو اُن کے بچپن کی یادیں سمیٹی ہوئی ہے۔ اس کہانی میں گلی ڈنڈا جیسے خالص ہندوستانی کھیل کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اسے باقی انگریزی کھیلوں کے برابر صف میں لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ اپنے بچپن کے دوست ''گیا'' کی ماہرانہ صلاحیت جس کا وہ مظاہرہ کرتا تھا ایک فطری انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ گیا کی چُستی پھرتی کے آگے کس طرح سے وہ بچپن میں بے بس تھے اور کس طرح دن بھر پدنے کی مشقت اٹھانا پڑتی تھی اور کوئی بہانہ کر کے ہی جان چھوٹتی تھی مصنف اس سب کی ہو بہو تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ہم گھڑی بھر کے کیلئے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ سب ہم ایک کہانی میں پڑھ رہے ہیں اور ہمیں یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ سب ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے۔

بیس سال بعد جب مصنف ضلع انجینئر بن کر اس قصبے میں لوٹتے ہیں تو بہت بڑی تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ بچپن کے دوست گیا کو بُلا کے لاتے ہیں اور گُلی ڈنڈے کا محبوب کھیل شروع کرتے ہیں۔ بچپن کی طرح کھیل کود میں دھاندلیاں اور بے ایمانیاں دہرا دیتے ہیں مگر گیا یہ سب نظر انداز کر دیتا ہے کیونکہ وہ ان کے رتبے سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن گاؤں میں ہونے والے گلی ڈنڈا کے میچ میں گیا کی چستی، پھرتی اور ماہرانہ صلاحیت دیکھ کر ضلع انجینئر حیران ہو جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ گیا نے کل اُس کے ساتھ کھیلنے کا بہانہ کیا تھا۔ بالآخر مصنف کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس عہدے اور رتبے نے اس سے اس کا بچپن کا ساتھی چھین لیا ہے۔ مصنف اپنی نظروں سے گر جاتا ہے اور گیا چھوٹا ہونے کے باوجود بہت عظیم ہو جاتا ہے۔

سوال: کہانی ''گُلی ڈنڈا'' میں اس کھیل کو کیسے ایک اچھا ہندوستانی کھیل بتایا گیا ہے؟

جواب: کہانی ''گلی ڈنڈا'' منشی پریم چند نے لکھی ہے۔ اس کہانی میں مصنف اپنے اس دیسی کھیل کی تعریف کرتے ہوئے اسے دوسرے انگریزی کھیلوں کی صف میں برابری کی جگہ دیتے ہیں۔ گلی ڈنڈے کا کھیل ایک ہندوستانی کھیل ہے جس پر کوئی خرچہ بھی نہیں آتا ہے اور کھلاڑیوں کی ایک بڑی فوج کو جمع کرنے کی کوئی مجبوری بھی اس میں نہیں ہوتی ہے۔ دو شخص مل کر اس کھیل کی شروعات کرتے ہیں اور بھرپور لطف حاصل کرتے ہیں۔ اس کے لیے مہنگے سامان کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور کسی وسیع میدان کی بھی اس میں شرط نہیں ہے۔ بس کسی درخت کی ایک ٹہنی کاٹ لی اور اسی سے گُلی بھی تیار کر لی اور کھیل شروع ہو گیا۔ اب رہی بات گلی سے کسی نقصان کے اندیشے کی؛ تو مصنف آگے بڑھ کر اس معاملے کو یہ کہہ کر حل کر دیتے ہیں کہ اس طرح کے نقصان کا خطرہ انگریزی کھیلوں میں بھی موجود رہتا ہے جیسے کرکٹ کی گیند سے سر پھوٹ سکتا ہے اور کبھی بلے سے کسی کی ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے۔

کہانی ''گلی ڈنڈا'' میں گیاؔ کا کردار:

کہانی ''گُلی ڈنڈا'' میں گیاؔ نامی ایک لڑکا مصنف کے بچپن کا ساتھی تھا جو اس کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتا تھا۔ دبلا پتلا سا مگر بہت پھرتیلا یہ لڑکا گلی ڈنڈے کا ایک ماہر کھلاڑی تھا۔ جس طرف یہ کھیلے اس طرف کے کھلاڑیوں کی جیت یقینی ہوتی تھی۔ اسلئے سب اسے آتا ہوا دیکھ کر اسے اپنی ٹیم کا کپتان بنانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے تھے۔ گیاؔ جب پدر ہار ہوتا تھا جو گلی کو لپک کر پکڑ لیتا تھا۔ گلی اس طرح خود بخود اس کے ہاتھوں میں آجاتی تھی جیسے اُس نے اِس پر جادو کر دیا ہو۔ اس طرح پدانے والے کی دومنٹ میں بالکل چھٹی کر دیتا تھا لیکن جب اس کے پدانے کی باری آتی تو وہ پداتے پداتے شام کر دیتا تھا اور پدنے والوں کو دن بھر دور دور مقامات کی سیر کرواتا۔ پدنے والے کوئی بے ایمانی یا جھگڑا کر کے ہی گیاؔ سے اپنی جان چھڑا سکتے تھے۔ مگر یہی گیاؔ جب بیس سال بعد مصنف (ضلع انجینئر) سے ملتا ہے اور اس کی ساری دھاندلیوں سے نظریں چرا لیتا ہے۔ گیاؔ کی یہ دریا دلی دیکھ کر مصنف کے دل میں اُس کی عظمت کا احساس ہو جاتا ہے۔

کہانی ''گلی ڈنڈا'' میں ضلع انجینئر کا کردار

کہانی ''گُلی ڈنڈا'' منشی پریم چند کی لکھی ہوئی ایک کہانی ہے۔ اس کہانی میں ضلع انجینئر کے کردار کے پردے میں خود مصنف بول رہا ہے۔ اس ضلع انجینئر کا بچپن گاؤں میں گزرتا ہے جہاں اس کا والد تھانے دار تھا۔ یہ بچپن میں گیاؔ کا ساتھی تھا اور دن بھر اس کے ساتھ گُلی ڈنڈے کے کھیل میں مصروف رہا کرتا تھا۔ لیکن جب اس کے والد کا تبادلہ شہر میں ہو جاتا ہے تو یہ بہت خوش ہو جاتا ہے اور خوشی خوشی اپنے گاؤں کے چھوڑنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ بیس سال کے عرصے کے بعد جب اس گاؤں میں پھر ضلع انجینئر کی حیثیت سے لوٹتا ہے تو اس گاؤں کو بالکل بدلا ہوا پا لیتا ہے۔ یہاں اس کے بچپن کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اپنے بچپن کے ساتھی گیاؔ کو تلاش کرتا ہے اور پھر اُس کے ساتھ گُلی ڈنڈے کے کھیل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ گُلی ڈنڈے کے کھیل کا شوق اور اپنے گاؤں اور اپنے دوست گیاؔ کی محبت بھری یادوں میں وہ کچھ اس طرح مدہوش ہو جاتا ہے کہ اسے اس بات کا بالکل خیال ہی نہیں رہتا ہے کہ اب وہ بچہ نہیں بلکہ ایک بڑا عہدہ دار ہے۔ مختصر یہ کہ ضلع انجینئر کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو اپنے بچپن اور اس کی حسین یادوں کو شہر جا کر اور ایک بڑا عہدہ پا کر بھی نہیں بھولتا ہے اور ان کو اب بھی عزیز رکھتا ہے۔

ترقی پسند تحریک

تعارف :

ترقی پسند تحریک ایک عالمی تحریک تھی۔ اس تحریک نے ادب کو زندگی سے جوڑ دیا اور کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے مسائل اور معاملات کو ادب میں جگہ دی۔ یہ تحریک کارل مارکس کے اشتراکی نظریات کی بنیاد پر کھڑی ہوئی اور انقلاب روس نے اس کو زمینی اساس فراہم کی۔ اس مضمون میں ہم اس تحریک کے پسِ منظر اور اردو ادب پر اس کے اثرات پر بات کریں گے۔ ساتھ ہی اس مضمون میں ہم اس تحریک کی بنیادی اصولوں اور اس کے ارتقاء اور زوال کے بارے میں بھی لکھیں گے۔ یہاں پر ترقی پسند ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔

مقاصد:

۱۔ طلاب ترقی پسند تحریک کے بارے میں جانیں۔

۲۔ طلاب ترقی پسند ادب کی پہچان کر سکیں۔

۳۔ طلباء تحریک کے عروج و زوال کی وجوہات کا جائزہ لے سکیں۔

آموزشی ماحصل:

۱۔ طلاب ترقی پسند تحریک کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

۲۔ طلاب ترقی پسند ادب کی تفہیم کرتے ہیں۔

۳۔ طلاب اشتراکی اور مارکسی نظریات پر اپنے الفاظ میں مختصر مضامین لکھتے ہیں۔

۴۔ طلاب ترقی پسند ادیبوں کے فن پارے پڑھتے ہیں۔

۵۔ طلباء تحریک کے ارتقاء اور زوال کا جائزہ لیتے ہیں۔

موضوع کی تفصیل:

پسِ منظر:

کارل مارکس نے اپنے انقلابی اور اشتراکی نظریات پیش کر کے محنت کشوں اور مزدوروں کو جینے کا ایک نیا حوصلہ عطا کیا۔ اُن کے انقلابی نظریات کو سب سے پہلے روس کے مزدوروں نے عملی جامہ پہنایا۔ 1917ء میں روس میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ روس کے محنت کش لینن کی سربراہی میں بادشاہِ روس زار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی اس شاندار فتح کی گونج ساری دنیا میں سنائی دی۔ یہ زمانہ دنیا میں سماجی نابرابری اور ظلم واستبداد کا زمانہ تھا۔ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام نے دنیا میں کسانون، مزدوروں اور غریبوں کی کمر توڑ دی تھی۔ دوسری طرف ہٹلر نے جرمنی میں اپنے فسطائی نظریات کی آبیاری کرتے ہوئے ادیبوں، دانشوروں اور عالموں کو قید کرنے کا ظالمانہ عمل شروع کیا تھا۔ اظہار رائے کی آزادی سلب تھی۔ اس آمرانہ پالیسی نے عام لوگوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اس نظام زندگی کے خلاف آہستہ آہستہ نفرت پروان چڑھ رہی تھی۔ انقلاب روس نے ایسے لوگوں کی ہمت بڑھائی اور اس سب کے خلاف محاذ آرائی شروع ہوئی۔ ادیب بھی اس محاذ آرائی میں شریک ہوئے اور ادب کے پیمانے بدلنے کی کوشش ہوئی۔

1935ء میں دنیا بھر کے ادیب پیرس میں جمع ہوئے۔ اس کانفرنس میں ہمارے ملک کی طرف سے ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے شرکت کی۔ یہ دونوں ادیب اس وقت لندن میں قیام پذیر تھے۔ پیرس سے واپس آنے کے بعد ان ادیبوں نے کچھ انگریز دوستوں اور ہندوستانی نوجوانوں کی مدد سے لندن کے نان کنگ ریسٹورنٹ میں ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں ان دو کے علاوہ محمد الدین تاثیر، جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا نے بھی شرکت کی۔ یہاں پر انہوں نے ''انجمنِ ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد رکھی۔ 1935 میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے اور الہ آباد میں اپنے دوستوں خاص طور پر احمد علی، پروفیسر محمود ظفر اور رشید جہاں سے مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین (Progressive writers association) کے منشور اور مقاصد کی وضاحت کی اور پھر ہندوستان میں اس کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان کی فضا اُس وقت اس تحریک کیلئے سازگار تھی۔ کیونکہ انگریزوں کے ظلم و جبر، جاگیرداروں کی چیرادستی اور سرمایہ داروں کی لالچ نے غریب عوام کو پامال کر دیا تھا۔ آزادی کی لڑائی عروج پر تھی اور اسی فضا میں یہاں یہ تحریک شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا عروج ہوا۔

ترقی پسند تحریک کا ارتقاء:

اُردو ادب کو زندگی سے قریب لانے، زندگی کا عکاس وترجمان بنانے اور اسے تنقید حیات کا درجہ دینے میں ترقی پسند تحریک نے نمایاں

کردار ادا کیا۔ 1936ء میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی پہلی کانفرنس لکھنو میں ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ جس میں یہ طے ہوا کہ ہندوستانی شاعر اور ادیب طبقاتی کشمکش میں حصہ لیں گے اور محنت کشوں کی حمایت کریں گے۔ نسلی تعصب، فرقہ پرستی اور انسانی استحصال کے خلاف آواز اُٹھائیں گے۔ نیز یہ کہا گیا کہ شعروادب کو عوام کے قریب لایا جائے گا۔ اس کانفرنس میں پریم چند کا صدارتی خطبہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند نے اپنے خطبے میں کہا:

''ہمیں اب حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔۔۔ ہماری کسوٹی پر اب وہی ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''

انجمن کے مقاصد:

انجمن نے اپنے منشور میں جن مقاصد کی نشاندہی کی وہ درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ فن اور ادب کو رجعت پسندوں کے چنگل سے نجات دلانا اور فنونِ لطیفہ کو عوام کے قریب لانا۔

۲۔ ادب میں افلاس، بھوک، غریبی، سماجی نابرابری اور طبقاتی کشمکش کی بات کرنا۔

۳۔ حقیقت نگاری کو پروان چڑھا کر بے روح تصوف اور بے مقصد روحانیت سے پرہیز کرنا۔

۴۔ فرسودہ اور بے سود روایات کو ترک کرنا۔

۵ ماضی کی فقط صحت مند روایات کو اپنانا۔

۶۔ ادبی تنقید میں ترقی پسند اور سائنسی اصولوں کو ترجیح دینا۔

انجمن نے ایک طے شدہ منشور کے تحت ادب لکھنے کی جو تحریک چلائی اس کو ترقی پسند تحریک کہتے ہیں اور اس تحریک کے تحت جو ادب لکھا گیا اس کو ترقی پسند ادب کہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک بہت جلد ہندوستان میں مقبول ہوگئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق اور علامہ اقبال جیسی قد آور شخصیات نے تحریک کی تائید کی۔ مجنوں گورکھپوری، اسرار الحق مجازؔ، فیض احمد فیضؔ، سردار جعفری، جوشؔ ملیح آبادی، معین احسن جذبیؔ، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، فراق گورکھپوری، جاں نثار اخترؔ، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی جیسے نامور شاعر، ادیب اور نقاد اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ اس تحریک کے پرچم تلے کافی مقدار میں شاعری، افسانے اور تنقید لکھی گئی۔ اگر چہ اس دوران ادب کے معیار پر کم توجہ کی گئی لیکن پھر بہت سارا ایسا ادب بھی تخلیق ہوا جس کو اعلیٰ ادب کہا جاسکتا ہے۔

اس تحریک کے جو نتائج برآمد ہوئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ادب میں حسن کاری پر توجہ کم ہوگی۔ مواد اور موضوع پر زور دیا جانے لگا۔ ترقی پسند ادب تو عوام کے لیے تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ وہ عوام کی زبان میں ہو۔ مطلب یہ کہ سادہ وسہل ہو۔ ترقی پسند تحریک نے اشتراکیت (کمیونزم) کی حمایت کی۔ آہستہ آہستہ یہ تحریک شدت پسندی کی شکار ہوئی۔ اس تحریک سے وابستہ کچھ ادیبوں نے ادبی اصولوں کی دھجیاں اُڑا کر خالص اشتراکی پروپگنڈے کی وکالت کی۔ 1960ء تک آتے آتے تحریک تقریباً ختم ہوگئی اور اس کی جگہ جدیدیت نے لی۔

محاکمہ:

بہت سے نقادوں نے ترقی پسند تحریک کو علی گڑھ تحریک کی توسیع قرار دیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ علی گڑھ تحریک کا مقصد 1857ء کی بغاوت کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں میں زندگی کی نئی رمق چھوڑنا تھا اور ترقی پسند تحریک کا نصب العین اشتراکی نظریات کے تحت طبقاتی کشمکش میں شریک

ہوکرادب کوتبدیلی کا آلہ بنانا تھا۔اس تحریک نے اگرچہ ادب میں نئے موضوعات کوجگہ دی مگر کچھ حضرات نے اس تحریک کا فائدہ اُٹھا کرادبی اقدار کو پامال کردیا۔ذرا ان شعری مثالوں پرغور کیجئے:

میرے ہونٹوں پر نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے
تیرے ماتھے پر یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تُو اس آنچل کا اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس سب کے باوجود اس تحریک نے اردو ادب کو نئے رنگ وآہنگ سے متعارف کیا اور عوام کے نزدیک لا دیا۔اس تحریک سے وابستہ قلمکاروں نے اعلٰی ادبی تخلیقات بھی پیش کیں جن کوا اج تک سراہا جارہا ہے اور اُن کی افادیت میں نصف سے زیادہ صدی گذرنے کے باوجود بھی کمی نہیں آئی ہے۔

جانچ :

سوال نمبرا۔ پریم چند کے والد کا نام بتائے؟

سوال نمبر۲۔ پریم چند کے پانچ افسانوں کے نام لکھئے۔

سوال نمبر۳۔ گیا کے کردار پر پانچ جملے لکھئے؛

سوال نمبر۴۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد کس کے نظریات پر ہے؟

سوال نمبر۵۔ لندن کے کس ریسٹونٹ میں اس کی بنیاد پڑی؟

سوال نمبر۶۔ تحریک کیوں زوال کا شکار ہوئی؟

سوال نمبر۷۔ اس تحریک کے ساتھ وابستہ قلمکاروں کے نام لکھئے:

درجِ ذیل کوغور سے پڑھ کراس کے آخر پردئے گئے سوالات کے جواب لکھئے؛

’’گلی ڈنڈے کا کھیل ایک ہندوستانی کھیل ہے جس پر کوئی خرچہ بھی نہیں آتا ہے اور کھلاڑیوں کی ایک بڑی فوج کو جمع کرنے کی کوئی مجبوری بھی اس میں نہیں ہوتی ہے۔دوشخص مل کر اس کھیل کی شروعات کرتے ہیں اور بھر پور لطف حاصل کرتے ہیں۔اس کے لیے مہنگے سامان کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور کسی وسیع میدان کی بھی اس میں شرط نہیں ہے۔بس کسی درخت کی ایک ٹہنی کاٹ لی اور اسی سے گُلی بھی تیار کر لی اور کھیل شروع ہوگیا۔اب رہی بات گلی سے کسی نقصان کے اندیشے کی‘ تو مصنف آگے بڑھ کر اس معاملے کو یہ کہہ کر حل کردیتے ہیں کہ اس طرح کے نقصان کا خطرہ انگریزی کھیلوں میں بھی موجود رہتا ہے جیسے کرکٹ کی گیند سے سر پھوٹ سکتا ہے اور کبھی بلے سے کسی کی ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے‘‘۔

سوالات

ا۔ اس اقتباس کو کوئی معقول عنون دیجئے۔

۲۔ کس کھیل پر کوئی خرچہ نہیں آتا ہے؟

۳۔ کرکٹ کی گیند سے کیا ہوسکتا ہے؟

۴۔ گلی ڈنڈا کھیلنے کے لئے کیا چاہئے؟

کتابیات

۱۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک — احمد پراچہ

۲۔ تاریخ ادب اردو — جمیل جالبی

۳۔ اردو ادب کی تحریکیں — انور سدید

۴۔ ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر — قمر رئیس

۵۔ داستان سے افسانے تک — وزیر آغا

۶۔ پریم چند کے تیرہ افسانے — اطہر پرویز

مرحوم کی یاد میں

پطرس بخاری

تمہید

ہنسنا، مسکرانا، خوش ہونا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ یہ بات بھی فطری ہے کہ انسان ظلم کرنا پسند نہیں کرتا ہے، ظالم سے نفرت کرتا ہے۔ انسان کی ہنسی میں طنز کا پہلو بھی شامل ہوسکتا ہے یعنی انسان کسی شخص کی کسی کمزوری پر بطور طنز ہنسے یا معاشرے میں موجود کسی غلط رجحان کے خلاف طنزیہ جملوں، شعروں یا مضامین کے ذریعے صدائے احتجاج بلند کرے۔ اس سے اردو میں ایک صنف وجود میں آئی جسے ''طنز و مزاح'' کہتے ہیں۔ طنز و مزاح کا استعمال ہماری بول چال میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن ادبی اصطلاح کے طور پر اس کے بارے میں چند اہم باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

مقاصد :

۱۔ طالبِ علم طنز و مزاح کے بارے میں جانکاری حاصل کریں۔

۲۔ طالبِ علم طنز و مزاح سے محظوظ ہوسکیں۔

۳۔ طلاب طنز و مزاح کی تاریخ کا احاطہ کرسکیں۔

۴۔ مشہور مزاح نگاروں کی تخلیقات کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اُن کا تجزیہ کریں۔

آموزشی ماحصل :

۱۔ طالبِ علم طنز و مزاح سے محظوظ ہوتے ہیں۔

۲۔ طلاب طنز و مزاح کی تاریخ پر گفتگو کرتے ہیں۔

۳۔ طلاب اردو کے مشہور مزاح نگاروں کو پڑھتے ہیں اور اُن کی تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

تعارف

تعریف

طنز و مزاح ایک ایسے ادبی ردِ عمل کا اظہار ہے جس کے تحت انسان زندگی کی تکلیف دہ حقیقتوں کو ہنسی خوشی سے بسر کر پاتا ہے۔ طنز و مزاح میں ظرافت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ طنز اور مزاح دونوں الگ الگ نوعیت رکھتے ہیں۔ طنز میں غم و غصہ اور برہمی کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کی خرابیوں،

نقصانات، بدنظمی اور تلخیوں کو استہزائی انداز میں پیش کر کے ان کے نقصان دہ پہلوؤں کے تئیں حس کو پیدا کیا جاتا ہے۔ مزاح میں ہنسی کا عمل ہمدردانہ کیفیت کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا طنز کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

'' طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے۔ طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے تبدیل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔'' (اردو ادب میں طنز و مزاح : صفحہ ۴۳)

پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنی کتاب '' طنزیات و مضحکات '' میں انگریزی مصنف تھیکرے کے حوالے سے جو کچھ لکھتے ہیں اس کا مختصر یہ ہے کہ طنز وسعت کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ پر ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ مکر و فریب کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اس سے ہمارے جذبات میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور ہم ان جذبات کو برسر پیکار لانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مظلوم کے لئے شفقت اور ظالم کے لئے نفرت محسوس کرتے ہیں۔ (طنزیات و مضحکات۔ صفحہ ۲۶)

مزاح کا اصل سر چشمہ ہنسی کا جزبہ ہوتا ہے۔ ہنسی کے سلسلے میں ارسطو کا خیال ہے کہ ہنسی اس کمی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرض وجود میں آتی ہے جو درد انگیز نہ ہو۔ اردو کے تمام مزاح نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ ہنسی انسان کو اعصاب شکنی کے حالت سے فوری طور پر نجات دلانے کا بہتین وسیلہ ہے۔

طنز و مزاح کا ارتقاء

اردو میں طنز و مزاح کا رواج فارسی کے زیر اثر ہوا۔ اردو غزلیات میں وعظ محتسب، زاہد کے معاملات کا تذکرہ، محبوب کو جور و جفا اور ظلم و ستم کے سلسلے میں شعرا کی موشگافیاں، قصائد میں ذاتی حالت کے بیانات اور ہجویات اور شہر آشوبوں میں معاشرے اور عہد کے حالت کی خرابیوں اور ناہمواریوں کے اظہار اور شعراء کے درمیان میں معاصرانہ چشمکوں میں ایک دوسرے کی کمزوریوں کو نشانہ بنانے کے سلسلے میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے بعد نظیر اکبر آباری کی کئی نظمیں معیار اور اظہار کے لحاظ سے اردو طنز و مزاح کی روایت میں سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں طنز و مزاح کی روایت نے استحکام غدر ۱۸۵۷ کے بعد کے زمانے میں حاصل کرنے شروع کی۔ خصوصاً مرزا غالبؔ کے خطوط کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں اور پھر '' اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں کی تخلیقات نے طنز و مزاح میں نہ صرف وسعت، تنوع اور گہرائی پیدا کی بلکہ طنز کی روایات کو مستحکم کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔

اودھ پنچ کے علاوہ کئی انفرادی کاوشیں بھی برسر منظر آئیں۔ سرشار کیس فسانہ آزاد کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

پطرس بخاری

حالاتِ زندگی

پطرس بخاری کا اصل نام سید احمد شاہ بخاری ہے۔ والد کا نام سید اسد اللہ شاہ بخاری ہے۔ ان کی پیدائش یکم اکتوبر 1898ء کو پشاور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کرنے کے بعد لاہور گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے جہاں چھ سال تعلیم حاصل کر کے وطن واپس لوٹے۔ وطن واپسی پر لاہور میں ٹیچرس کالج کے پروفیسر بنائے گئے پھر لاہور گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ نے کئی اعلیٰ عہدوں جیسے آل انڈیا ریڈیو کے اسسٹنٹ کنٹرولر، لاہور کالج کے پرنسپل ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل اور شعبہ اطلاعات اقوامِ متحدہ کے جنرل سیکریڑی وغیرہ پر بھی کام کیا ہے۔ آپ کا انتقال 1958ء میں نیویارک امریکہ میں ہوا۔

ادبی کارنامے:

پطرس انگریزی زبان کے ادیب اور استاد تھے۔ اُردو زبان میں انہوں نے کم مگر اعلیٰ پایہ کا لکھا ہے ان کا صرف ایک مجموعہ شایع ہوا ہے اور چند رسائل میں کچھ مضامین منظرِ عام پر آئے۔ مگر یہ مختصر تحریرات اپنے فطری انداز، روانی، لطافت اور شگفتگی کی بناء پر ان کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک مناسب اور ممتاز مقام دلانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اُردو مزاح نگاری کو ایک نئے راستے پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریر پُر لطف اور زوردار ہوتی ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''پطرس کے مضامین'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مرید پور کا پیر، میں ایک میاں ہوں، سویرے جو کل آنکھ کھلی میری، مرحوم کی یاد میں وغیرہ اُن کے مشہور مضامین ہیں۔

پطرس کا طرزِ تحریر/ اسلوب/ نثر نگاری

پطرس کی تحریر اس قدر پرلطف ہے کہ پڑھنے والا اُن کے مضامین پڑھتے وقت خود بخود ہنسنے لگتا ہے۔ ان کی تحریر نہایت جاندار ہے۔ اُن کی زبان سادہ، دلکش اور رواں ہے۔ شگفتگی اور لطافت نے اُن کے مضامین میں بڑی تاثیر پیدا کردی ہے۔ کہیں کہیں وہ جملوں کی ساخت اور الفاظ کی ترتیب سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی زبان سادہ مگر طرزِ تحریر ظریفانہ ہے۔ چند مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ اُن کی کُل ادبی کائنات ہے لیکن یہ مختصر ادبی سرمایہ ہی اُنہیں مزاح نگاروں کی صفِ اول میں ایک ممتاز مقام پر فائز کرنے کیلئے کافی ہے۔

پطرس کی مضمون نگاری/ طنز و مزاح نگاری

پطرس انگریزی کے اچھے ادیب تھے۔ اُن کے مضامین میں انگریزی ادب کی لطافتوں کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ وہ ہنسانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واقعات کے تسلسل اور کرداروں کی حرکات اس طرح فطری انداز میں دکھاتے ہیں کہ مزاح کا پہلو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ پطرس کا مشاہدہ گہرا ہے وہ ذہین قلم کار ہیں۔ پطرس بخاری کے مزاح میں نفاست ہے۔ اُنہوں نے بہ ظاہر معمولی باتوں کو طنز و مزاح کی دلکشی عطا کی۔ پطرس کے مزاح میں خلوص اور توانائی ہے۔ اُن کے مضامین میں کہیں کہیں طنز کی خوشگوار لہریں نظر آتی ہیں۔ پطرس اپنی مخصوص سطح سے نیچے نہیں اُترتے۔ اُن کے یہاں دوسرے مزاح نگاروں کی طرح پھکڑ پن نہیں دکھائی دیتا۔

مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' کا خلاصہ

مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' پطرس بخاری نے تحریر کیا ہے۔ پطرس اپنے دوست مرزا سے گفتگو کے دوران دنیا کے نظام پر برہمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے مطابق دنیا میں دولت کی تقسیم غیر مساوی طور پر کی گئی ہے۔ یہاں کچھ لوگ عیش کرتے ہیں اور کچھ دو وقت کی روٹی کو بھی ترستے ہیں۔ اس مجبوری کے عالم میں ایک انسان اور حیوان کا درمیانی فرق بہت کم ہو کے رہ گیا ہے۔ پطرس ایک موٹر کار خریدنے کی بات کرتے ہیں کیونکہ ساری عمر انہوں نے پیدل سفر کر کے بہت پریشانی اُٹھائی ہے۔ مرزا ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے انہیں ایک سائیکل خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں اور اپنی ایک سائیکل مفت میں دے دینے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ مگر پطرس چونکہ ایک خود دار طبیعت کے مالک ہیں اسلئے مفت لینا گوارا نہیں کرتے۔ کُل ملا کے اُن کے پاس چھیالیس روپے موجود تھے اور انہوں نے چالیس روپے مناسب رقم سمجھ کر کے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور سائیکل بھجوا دینے کا ان سے وعدہ لیا۔

پطرس سائیکل پانے کی خوشی میں رات بھر سو نہ سکے اور مختلف مقامات کی سیر کے منصوبے بناتے رہے مگر اگلے روز جس سائیکل نما چیز کو وہ اپنے گھر میں موجود دیکھتے ہیں وہ حیران ہو جاتے ہیں۔ سائیکل کی حالت کسی قدر اپنے نوکر سے ٹھیک کروا کے وہ صبح سویرے سیر کو نکل جاتے ہیں مگر سائیکل ہے کہ ٹھیک سے چلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس کے ہر پرزے سے عجیب طرح کی آوازیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ کبھی گدی نیچے ہو جاتی ہے تو کبھی ہینڈل جھک جاتا اور عجیب آوازوں سے فضاؤں میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ پطرس اس سائیکل پر سوار ہو کے جہاں سے گزرتے ہیں لوگ انہیں کی طرف دیکھنے لگتے

ہیں۔اس شور شرابے کے دوران کئی مرتبہ وہ سائیکل سے نیچے اتر کر اس کی مرمت کرتے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔

بالآخر سائیکلوں کی ایک دکان پر لے جاتے ہیں مگر وہاں بھی اس سائیکل کی وجہ سے انہیں بہت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔سائیکل کی مرمت کروا کے ابھی کچھ ہی قدم آگے چلتے ہیں کہ بے قابو ہو کر سائیکل سے نیچے گر جاتے ہیں۔سائیکل کا ایک پہیہ سڑک کے دوسرے کنارے لڑھکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ان کے اِردگرد اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔اکثر لوگ ان پر ہنستے ہیں۔پطرس بہت شرمندہ ہو جاتے ہیں۔آخر ہمت کر کے سائیکل کے ٹکڑے جمع کر کے سر جھکا کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔رستے میں بھی لوگوں کی ہنسی مذاق کا انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ آگے بڑھتے ہیں اور بالآخر ایک پُل پر پہنچ کر وہ اس سائیکل کو بے نیازی سے دریا میں پھینک دیتے ہیں اور گھر آ کر کیمسٹری کی کتاب کا پھر مطالعہ کرنے لگتے ہیں کہ شاید بم بنانے کا نسخہ ہاتھ آ جائے۔

سوال: ''مرحوم کی یاد میں'' کے مطالعہ کے دوران آپ نے کس کس مقام پر شوخی، مزاح اور طنز محسوس کیا؟

جواب: پطرس کا مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' خالص مزاح کا نمونہ ہے جس میں طنز کی نہایت خفیف اور خوشگوار لہریں جابجا نظر آتی ہیں۔اس مضمون کے مطالعہ کے دوران ایسے کئی مقام آتے ہیں جہاں شوخی، مزاح اور طنز کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔مصنف کا بائیسکل کو دیکھ کر حیران ہونا، بائیسکل پر سوار ہونے کے بعد بائیسکل سے عجیب وغریب آوازیں برآمد ہونا، بائیسکل ٹھیک کرنے والے کا مصنف کو مشکوک نظروں سے دیکھنا اور طعنہ دینا پھر مصنف کا بائیسکل ٹوٹنے کی وجہ سے گر جانا وغیرہ ایسے مقام ہیں جہاں شوخی، مزاح اور طنز محسوس کیا جاسکتا ہے۔

سوال: ''مرحوم کی یاد میں'' مضمون کا عنوان آپ کو کیسا لگا اور کیوں؟ طنزیہ، مزاحیہ یا سادہ؟

جواب: مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' بے حد مزاحیہ اور دلچسپ ہے۔لیکن اس سے یہ عرفان بھی حاصل ہوتا ہے کہ مرزا کے پردے میں ہزار ایسے چالاک لوگ ہیں جو دوستی کی آڑ میں بھولے بھالے لوگوں کو ٹھگ لیتے ہیں۔اس مضمون کے مزاح میں نفاست اور زبان میں سادگی ہے۔اس مضمون کی تحریر اس قدر پُر لطف ہے کہ اسے پڑھتے وقت خود بخود ہنسی آ جاتی ہے جو اس مضمون کی خاص خوبی ہے۔اس کا واقعہ مختصر ہے مگر جس انداز میں مصنف نے اس کو پیش کیا ہے وہ کافی مزاحیہ اور پُر لطف ہے۔مرزا کا مصنف کو اپنی پرانی بائیسکل دینا، بائیسکل کی وجہ سے مصنف کا پریشان ہو جانا، بائیسکل ٹوٹنے کے باعث مصنف کا ذلّت اُٹھانا ایسے دلچسپ مناظر ہیں جن کو پڑھتے وقت بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' ایک عمدہ مزاحیہ مضمون ہے۔

سوال: پطرس بخاری نے جو بائیسکل مرزا سے خریدی تھی، اُس کا خاکہ پیش کیجئے۔

جواب: پطرس بخاری نے جو بائیسکل مرزا سے خریدی تھی وہ بائیسکل نہیں بلکہ ایک عجیب وغریب ڈھانچہ تھا۔جب وہ اُس پر سوار ہوئے تو اس کی رفتار ایسی تھی جیسے تارکول سڑک پر بہہ رہا ہو۔جب اُنہوں نے پیڈل پر پاؤں رکھا تو پتہ چلا کہ کوئی مردہ قبر سے اُٹھ آیا ہے اور اس کی ہڈیاں چیخ رہی ہیں۔پچھلے پہیہ کے ٹائر کے اندر ٹکڑے رکھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے جھٹکے بھی لگ رہے تھے۔ہینڈل ہاتھ کے دباؤ کی وجہ سے نیچے چلا جاتا تھا اور کبھی گدی نیچے بیٹھ جاتی تھی۔وہ جب پیڈل پر دباؤ ڈالتے تھے تو گھٹنے ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔پہیوں کے نازنخرے، ہینڈل اور گدی کے اونچا نیچا ہونے کی وجہ سے پطرس کی حالت بڑی ابتر تھی۔الغرض بائیسکل کی مجموعی حالت بہت خستہ تھی۔

سوال: مرزا کے کردار کی وضاحت کیجئے۔

جواب: مضمون میں مرزا کا جو کردار مصنف نے کھینچا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا بہت ہی چالاک اور عیار قسم کے انسان ہیں وہ اپنے دوست کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی پرانی خستہ بائیسکل چالیس روپے کے عوض پطرس کو سونپتے ہیں جس کی وجہ سے پطرس کو کافی پریشانی اُٹھانی پڑتی

ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا میں بے مروّتی اور خودغرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ دوست کی مجبوری میں کام آنے کے بجائے اُس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنے والا مرزا مخلص دوست نہیں بلکہ دوست کی شکل میں اپنا الّو سیدھا کرنے والا ایک خودغرض اور لالچی انسان ہے۔

جانچ

درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھئے

۱۔ طنز اور مزاح میں کیا فرق ہے؟

۲۔ اردو کے پانچ مزاح نگاروں کے نام لکھئے:

۳۔ پطرس بخاری نے کن عہدوں پر کام کیا؟

۴۔ مرزا کے کردار پر چند جملے لکھئے:

کتابیات

۱۔	مضامینِ پطرس	پطرس بخاری
۲۔	اردو میں طنز و مزاح	وزیر آغا
۳۔	طنزیات و مضحکات	رشید صدیقی
۴۔	گلدستہ اردو	پروفیسر جوہر قدوسی

شاعری کی حقیقت

علامہ شبلی نعمانی

تمہید:

انسان فطرتاً اچھی چیز کو پسند کرتا ہے اور بُری چیز کو ناپسند کرتا ہے۔لیکن انسان کو یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ اچھی چیز کون سی ہے اور بُری چیز کون سی ہے؟ یہ جاننے کے لئے قدرت نے انسان میں ایک شعور اور حس پیدا کی ہے۔اس کو ہم تنقیدی شعور یا تنقیدی حِس کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعور ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔

انگریزی شاعر کولرج (1834-1772ء) نے ایک جگہ ایک مرد اور ایک عورت کا ذکر کیا ہے جو کسی آبشار کا نظارہ کر رہے تھے۔مرد نے کہا: ''یہ کیسا جلال رکھتا ہے!'' عورت نے جواب دیا ''بہت خوبصورت ہے۔'' ایسا نہیں کہ عورت حسن کا احساس نہ رکھتی تھی البتہ یہ ہے کہ وہ قاہری اور دلبری میں فرق کرنا نہیں جانتی تھی۔مرد نے جلال کی بات کی اور عورت نے اس کو جمال سے تعبیر کیا۔ بہر حال ذیل میں ہم اسی تنقیدی شعور کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے نیز یہ بھی معلوم کرلیں گے کہ اس تنقیدی شعور کے ذریعے ادبی فن پاروں کی قدر و قیمت کیسے متعین کی جاتی ہے۔

تعارف:

ادبی تنقید کیا ہے؟ شعر و ادب پر گفتگو ہو، شاعری پر تبصرہ ہو، زبان و بیان کے محاسن و معائب واضح کرنے ہوں، فن پاروں کی ادبی قدریں متعین کرنا ہو، یہ سب چیزیں تنقید کے دائرے میں آتی ہیں۔ بڑے تخلیقی کارنامے اچھی تنقید کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔

پروفیسر آل احمد سرور کے بقول ''اُردو میں ملا وجہی سے لے کر حسرت موہانی تک ہر شاعر میں کار آزمودہ تنقیدی شعور پایا جاتا ہے۔ بیاضوں، تذکروں، تقریظوں، دیباچوں اور مکاتیب میں تنقیدی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ شاعروں اور ادبی صحبتوں میں شعر وشاعری اور فکر وفن پر تبصرے برابر ہوتے رہتے ہیں۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُردو میں ابتدائی تنقید کے نمونے قدیم زمانے سے ہی موجود ہیں۔ اسی تنقیدی شعور کی بنا پر خان آرزو سودا کے شعر کو ''حدیثِ قدسی'' کہتے تھے۔ آتشؔ، دبیرؔ کے مرثیوں کو لندھور بن سعد کی داستان بتاتے تھے۔ غالبؔ شاعری کو معنی آفرینی سمجھتے تھے لیکن اُردو میں باضابطہ تنقید مولانا الطاف حسین حالیؔ سے شروع ہوئی۔

حالیؔ سے پہلے شاعر استادوں کو جانتے تھے نقادوں کو نہیں۔ حالی نے بقول آل احمد سرور شاعری، ادب، زندگی، اخلاق، سماج، غزل، نظم کے متعلق اصولی سوالات کئے۔

اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مؤرخ، ماہر نفسیات، شاعر اور پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے۔ ہر انسان میں حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن ہر شخص کا ذوق پختہ نہیں ہوتا وہ تنقید کی قدر نہیں کر سکتا۔ تنقید فن پارے کو مناسب جگہ دیتی ہے۔ ہر نئے سچ کو زندگی کی بڑی سچائی کے سانچے میں ڈالتی ہے۔ جھوٹ کو سچ سے الگ کرتی ہے جب جھوٹ سچ کا لباس پہن کر آئے۔ گویا تنقید ادب کیلئے بھی اور ادیبوں کیلئے بھی ایک مشعلِ راہ ہے۔

یہ اُس خوشی کو جو سچے ادب سے حاصل ہوتی ہے نشاطِ زندگی کا ایک وسیلہ بناتی ہے۔ تنقید فیصلہ کرتی ہے، دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت کرتی ہے، تجزیہ کرتی ہے، قدریں متعین کرتی ہے۔ ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے۔ انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ، پست اور بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید کے بغیر ادب ایک جنگل ہے ایک ایسا جنگل جس میں پیداوار کی کثرت ہے موزونیت اور قرینے کا پتہ نہیں۔

تنقید نئی قدروں سے فیض حاصل کرتی ہے لیکن قدیم پیمانوں کو بیک قلم رد نہیں کرتی۔ نئی تنقید میں تاریخی شعور، تسلسل کا لحاظ اور ماضی کا احساس ملتا ہے لیکن یہ خوبیاں ہر جدید تنقید لکھنے والے کے یہاں موجود نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نیا س حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ وہ کس حد تک اپنے قدیم ادبی سرمایے کے امین ہیں۔ اُس روایت کے آئینہ دار اور اُس مزاج کے مظہر ہیں جو تہذیب وتمدن نے دیا۔ وہ کس حد تک نئے اور کس حد تک پرانے ہیں۔ اقبال کی مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اقبال کی شاعری میں یا بالِ جبریل کی غزلوں میں ہمیں نئے خیالات ملتے ہیں مگر یہ نئے خیالات اُس شعریت کے ملتے ہیں جو مانوس ہے اور مقررہ سانچوں کے مطابق۔ یعنی اقبال جدید ہیں مگر اُن کی جدّت انہیں قدیم شعریت سے بے پروا نہیں کرتی۔

تنقید کے کئی دبستان ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقادوں کے فکر ونظر نے تنقید کو مخصوص جہتیں دی ہیں۔ مثلاً کسی نے متن کی ہیئت پر زور دیا۔ کسی نے تخلیق کار کی نفسیات کو مطالعہ کی بنیاد بنایا۔ کسی نے تاریخی زاویے سے متن کو پڑھا۔ کوئی الفاظ کی دروبست کی طرف مائل رہا۔ کسی نے تجزیہ وتحلیل پر نگاہ مرکوز کی۔ کسی نے غیر ملکی تنقیدی نظریات کی روشنی میں اپنے ملک کا ادب پڑھا۔ اسی نے تنقید میں کئی مختلف نظریات کو جنم دیا۔

اُردو کے بڑے تنقید نگاروں میں حالی، شبلی، کلیم الدین، حسن عسکری، آل احمد سرور، احتشام حسین، اختر رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، شمس الرحمان فاروقی، وارث علوی، گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، وزیر آغا، حامدی کاشمیری، جاوید قدوس وغیرہ نے ادبی تنقید کے بہترین نمونے پیش کئے۔

آپ نے کیا سیکھا:

ا۔ انسان اچھی چیز کو پسند کرتا ہے، بری چیز سے نفرت کرتا ہے۔

۲۔ انسان میں ایک تنقیدی حِس ہوتی ہے جس سے انسان اچھی یا بُری چیز کا ادراک کرتا ہے۔

۳۔ ادبی تنقید میں نثری یا شعری فن پاروں کی ہیئت، الفاظ، مضمون، شاعر یا ادیب کے احوال، نفسیات، تاریخی پسِ منظر وغیرہ پر گفتگو ہوتی ہے۔

۴۔ اُردو میں تنقید کے نمونے پہلے بھی موجود تھے البتہ باقاعدہ تنقید کا آغاز حالی سے ہوا۔

۵۔ تنقید کھرے اور کھوٹے میں فرق کرتی ہے۔ وہ ہمیں سکھاتی ہے کہ اچھا فن پارہ کیا ہے اور کیوں ہے؟

۶۔ خراب فن پارہ کیا ہے اور کیوں ہے؟

۷۔ تنقید کے کئی دبستان ہیں۔ اُردو میں کئی ایسے بڑے تنقید نگار گذرے ہیں جنہوں نے اچھی تنقید لکھی۔

موضوع:

علامہ شبلی کا مضمون ''شاعری کی حقیقت'' بہت اہم اور معلومات افزا مضمون ہے۔ شبلی نے اس میں شاعری کی حقیقت کو نثر کی مختلف اصناف سے موازنہ کر کے سمجھایا ہے۔

ابتداء میں شبلی نے ادراک اور احساس کے درمیان باہم فرق کو سمجھایا ہے۔ ادراک کا کام کسی چیز کی حقیقت کو معلوم کرنا ہے یا استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے لیکن احساس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو احساس متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے اور خوشی میں سرور ہوتا ہے۔ یہی احساس جب الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعری کہلاتا ہے۔ حیوانات پر بھی خوشی یا غم کی کوئی کیفیت گذرتی ہے تو مختلف حرکات یا آوازوں کے ذریعے اظہار کرتے ہیں لیکن انسان کو قدرت کی طرف سے زبان ملی ہے وہ اس کیفیت کا اظہار زبان سے کرتا ہے۔ اسی کو شعر کہتے ہیں۔

اب ہمارے پاس شعر کی ایک تعریف آ گئی۔ ''دل پر طاری ہونے والی کسی کیفیت کا اظہار جب الفاظ میں کیا جائے تو وہ شعر ہے۔'' شاعر پر اس کیفیت کا گہرا اثر ہوتا ہے اور سامعین پر بھی یہ اثر چھوڑتا ہے۔ لیکن دل پر موسیقی، مصوری اور صنعت گری بھی اثر کرتی ہیں۔ تو کیا یہ شاعری ہے؟ جواب ہے ''نہیں'' یہ شاعری نہیں ہے کہ انسان کے پاس قوتِ باصرہ ہو۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈالتی ہے۔ یہ قوتِ باصرہ، سامعہ، شامہ، لامسہ اور ذائقہ سب کو بیک وقت متاثر کرتی ہے۔

شاعری اور سائنس میں کیا فرق ہے؟ سائنس استدلال سے کام لیتی ہے لیکن شاعری احساسات کو دلکش منظر دکھاتی ہے۔ شاعری کی یہ خصوصیت موسیقی اور مصوری دونوں میں موجود ہے تو کیا موسیقی اور مصوری بھی شاعری ہے؟ جواب ہے نہیں۔ کیوں کہ شاعری میں الفاظ ہوتے ہیں موسیقی اور مصوری میں الفاظ نہیں ہوتے۔ اب شاعری کی ایک اور تعریف سامنے آ گئی۔ ''جب انسان کسی کیفیت کو دل سے محسوس کر کے الفاظ کے قالب میں ڈال دیتا ہے، خود بھی کافی متاثر ہوتا ہے دوسروں کو بھی متاثر کرتا ہے اور یہ الفاظ ان کیفیات کے ساتھ تمام حواس پر اثر ڈالتے ہیں تو اسے شاعری کہتے ہیں۔''

لیکن ابھی بھی یہ تعریف مکمل نہیں ہے خطبہ، تاریخ، افسانہ، ڈرامہ میں بھی الفاظ ہوتے ہیں تو کیا یہ بھی شاعری ہے جواب ہے نہیں۔ کیوں کہ ان چیزوں میں خارجی واقعات اور بیرونی زندگی کی تصویر ہوتی ہے۔ جبکہ شاعری میں اندرونی جذبات اور احساسات سے کام ہوتا ہے۔ مثلاً تاریخ اور شعر کا فرق یوں سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ایک شخص نے جنگل میں ڈکارتے ہوئے مہیب شیر کو دیکھا۔ اُس کی پُر رعب گونج، بھیانک چہرہ اور خشمگیں آنکھوں نے اُسے ڈرایا۔ یہ شخص اگر کسی کے سامنے شیر کا حلیہ اپنے لفظوں میں بیان کرے تو یہ شاعری ہوگا۔ اس کے برعکس علم الحیوانات کا کوئی عالم کسی عجائب گھر میں گیا۔ شیر کٹہرے میں کھڑا ہے۔ اس نے شیر کو دیکھا۔ پھر علمی طریقے سے کسی مجمع میں شیر پر لیکچر دیا تو یہ تاریخ ہے یا واقعہ نگاری ہے۔ شاعری میں واقعہ نگاری تو ہوتی ہے لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ خارجی واقعات کیا ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ واقعات ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتے ہیں۔

اب رہی خطابت۔ شاعری اور خطابت میں کیا فرق ہے؟ خطابت کا مقصد حاضرین کو خطاب کرنا ہے۔ مقرر حاضرین کے عقائد، طبیعت کا میلان،

ذوق وغیرہ کی جستجو کرتا ہے تا کہ تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے جذبات میں حرکت پیدا ہو۔لیکن شاعر کو شعر کہتے وقت کسی سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کیلئے شاعری نہیں کرتا، نہ شعر کہتے وقت کسی کو مخاطب بناتا ہے۔اس کے دل میں جذبات ہوتے ہیں۔ بے اختیار ان کو ظاہر کرتا ہے جیسے نوحہ کرنے والا دل کی کیفیات سے مغلوب ہو کر نوحہ کرتا ہے نہ کہ کسی کو دکھانے کیلئے یا سنانے کیلئے۔لہٰذا جو بہ تکلّف شعر کہتے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ وہ اسلوب و انداز اختیار کریں کہ یہ مطلق پتہ نہ چلے کہ وہ کسی کو سنانا چاہتے ہیں۔

شاعری کے عناصر:

شبلی کے نزدیک ایک عمدہ شعر میں کئی باتیں پائی جاتی ہیں۔اس میں وزن ہوتا ہے، محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ خیال بندی ہوتی ہے۔الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں۔ بندش صاف ہوتی ہے، طرزِ ادا میں جدّت ہوتی ہے لیکن یہ سب چیزیں شعر کا لازمی اجزاء تو ہیں اصلی عناصر نہیں۔ پھر شبلی کہتے ہیں کہ شاعری اصل میں دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخیل۔ اُس شئے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگر چہ مادی اشیاء کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جاسکتی ہے چنانچہ اعلیٰ درجے کے مصور انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرے سے جذباتِ انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر، حیرت، استعجاب، پریشانی ظاہر ہو۔ جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی جس کے تلوے سہلائے جارہے تھے۔تلووں کے سہلاتے وقت چہرے پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرے سے نمایاں تھا۔تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دی سکتی۔ یہ شاعر کا کمال ہے۔قاآنی ایک جگہ اپنی نظم میں بہار کا سماں دکھاتا ہے جس میں کہتا ہے کہ ہلکی ہلکی ہوا آئی، پھولوں میں گھسی، کسی پھول کا گال چوم لیا، کسی کی ٹھوڑی چوس لی، کسی کے بال کھینچے، کسی کی گردن دانت سے کاٹی۔کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہنچی اور درخت کی ٹہنیوں سے ہوتی ہوئی نہر کے کنارے پہنچ گئی۔ بھلا اس سماں کو مصور تصویر میں کیوں کر دکھا سکتا ہے۔

تصویر اور محاکات میں یہ فرق بھی ہے کہ مصور تصویر کا ایک ایک خال وخط دکھاتا ہے ورنہ تصویر نامکمل ہوگی۔اس کے برعکس شاعر صرف ان چیزوں کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑے۔

ایک اور فرق یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ اثر پیدا کرسکتا ہے جو خود اس چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جُز نمایاں کر کے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کرسکتا ہے جو اصل چہرہ دیکھنے سے پیدا ہوسکتا ہے۔سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر پید انہیں ہوسکتا جو اس شعر سے ہوسکتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

مقالہ ایک جدید نثری صنف کا نام ہے۔ عالمی ادب میں اس صنف کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ مقالہ سے مراد وہ صنف ہے جو عالمانہ افکار کے مفصل اظہار کیلئے وجود میں لائی گئی ہے۔اردو زبان میں اس کا آغاز سرسید احمد خان کے ہاتھوں ہوا۔انہوں نے مختلف موضوعات اور مسائل پر غور کیا اور اپنے خیالات کو ربط اور تسلسل کے ساتھ عالمانہ زبان میں پیش کیا۔سرسید اور ان کے دوستوں جیسے حالؔی محسن الملک اور وقارالملک وغیرہ کے مقالے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوتے رہے۔اس کے بعد دوسرا رسالہ جس میں علماء کے مقالے شائع ہوتے رہے وہ سرعبدالقادر کا ''مخزن'' تھا۔اس رسالے نے بھی مقالے کی مقبولیت میں کافی اضافہ کیا۔مقالے میں مضامین کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔اس میں شعروادب، مذہب وسیاست، تہذیب وتمدن اور اصلاحِ معاشرت غرض ہر موضوع پر لکھا جاسکتا ہے۔اُردو زبان کے چند مشہور مقالہ نگاروں کے نام درج ذیل ہیں:۔

شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا آزاد، مولانا حالی، محمد علی جوہر، سلیمان ندوی، ظفر علی خان، حسن نظامی۔

مولانا شبلیؔ نعمانی

حالاتِ زندگی

مولانا شبلی نعمانی 1857ء میں ضلع اعظم گڈھ اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے زمانے کے بڑے مشہور عالموں جیسے مولوی شکراللہ اور مولوی محمد فاروق سے حاصل کی۔ شبلی کو علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے لیے انہوں نے سہارنپور، لاہور، رامپور اور لکھنو وغیرہ کا سفر کیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مکمل کر کے انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور کچھ وقت کیلئے وکالت بھی کی مگر جلد ہی اس پیشے کو ترک کر دیا۔ اُنہوں نے 19 سال کی عمر میں حج کیا۔ 1882ء میں سرسید احمد خان نے ان کی علمی صلاحیتوں کو پہچان کر انہیں علی گڈھ کالج میں فارسی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز کیا۔ اس کالج کی علمی فضا میں اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع ملا اور انہوں نے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ سرسید کی وفات کے بعد انہوں نے علی گڈھ چھوڑا اور حیدرآباد میں محکمۂ تعلیم کے ناظم مقرر ہوئے۔ 1898ء میں وہ کشمیر تشریف لے آئے۔ اُنہوں نے شام، مصر اور قسطنطنیہ کا سفر بھی کیا۔ پھر کچھ وقت لکھنو میں رہ کر اپنے آبائی وطن اعظم گڈھ لوٹ گئے جہاں 1913ء میں دارالمصنفین قائم کیا۔ شبلی کی علمی خدمات کے لئے حکومت کی طرف سے انہیں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ترکی کے سلطان نے بھی انہیں تمغۂ مجیدی عنایت فرمایا۔ شبلی کا انتقال 57 برس کی عمر میں 1914ء میں ہوا۔

طرزِ تحریر:

شبلی نعمانی اردو نثر اور نظم دونوں میں اپنی انفرادیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی زبان میں شگفتگی، روانی، اور سادگی پائی جاتی ہے۔ نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملے کو بھی بڑی آسانی سے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنے پر بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی عبارت میں کہیں کہیں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں مگر وہ اس انداز سے ان کا استعمال کرتے ہیں کہ وہ گراں نہیں گزرتے اور اُردو کی دلفریبی اور چاشنی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں جو چیز اپنے ہم عصر عالموں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا دلکش انداز، سنجیدہ لہجہ اور بلند معیار ہے۔ شبلی نے تنقید نگاری کے علاوہ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے بھی استعاروں اور تشبیہات سے خوب کام لیا ہے۔ بہت غور و فکر کے بعد مترنم الفاظ اور تراکیب کا دلکش انتخاب ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ ان کا اندازِ بیان پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ادبی کارنامے:

شبلی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کے موضوع مختلف ہیں۔ اُن کی ہمہ گیر طبیعت نے علمِ کلام، تاریخ و تنقید، سیرت جیسے میدانوں میں اپنی قابلیت دکھائی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نام تاریخ اور تنقید میں ہوا۔ شبلی کی طبیعت تحقیق اور تلاش کی طرف مائل تھی۔ انہوں نے ایک تنقید نگار کی حیثیت سے جو کچھ بھی لکھا، بڑی چھان بین کے بعد لکھا۔ تنقید نگاری اور شاعری کے علاوہ شبلی کے دیگر مضامین اور مکاتیب بھی اُردو ادب کا بیش قیمتی خزانہ ہیں۔ شبلی نعمانی نے تقریباً پچاس ہزار صفحات پر مشتمل ذخیرۂ ادب چھوڑا ہے۔ شبلی کے نثری، تنقیدی اور شعری کارناموں میں مندرجہ ذیل تصنیفات شامل ہیں:۔ سیرت النبی ﷺ، شعرالعجم، الغزالی، سوانح مولانا رومؒ، الفاروق، الکلام، موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، مقالاتِ شبلی، کلیاتِ فارسی، مجموعۂ نظم اُردو، علم الکلام، المامون، سیرتِ النعمان

سوال: دل پر کون کون سی چیزیں اثر کرتی ہیں؟

جواب: موسیقی، مصوّری، صنعت گری، شاعری وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو دل پر اثر کرتی ہیں لیکن شاعری کا اثر دل پر باقی فنونِ لطیفہ کے مقابلے میں زیادہ

ہوتا ہے۔

سوال: موسیقی کس قوت کو اثر انداز کرتی ہے اور تصویر سے متاثر ہونے کی کیا شرط ہے؟

جواب: موسیقی صرف قوتِ سامع یعنی سننے کی قوت کو اثر انداز کرتی ہے۔جبکہ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی یعنی آنکھوں کی روشنی ہونا لازمی ہے۔

سوال: انسان کے کن حواس کا ذکر اقتباس میں ہوا ہے؟

جواب: سامعہ(Hearing)،شامہ(Smelling)،باصرہ(Sight)،ذائقہ(Taste)اورلامسہ(Touch)وہ حواسِ خمسہ ہیں جن کا تذکرہ اقتباس میں ہوا ہے۔

سوال: جس اقتباس میں مختلف حواس کا تذکرہ ہے اس کا خلاصہ لکھئے اور عنوان دیجئے۔

جواب: جس اقتباس میں مختلف حواس کا تذکرہ ہے وہ ''شاعری کی حقیت'' کا چھٹا اقتباس ہے جو درج ذیل ہے:

جو چیزیں دل پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مزہ محسوس ہوتا ہے۔

سوال: تاریخ اور شعر کا فرق لکھئے۔

جواب: تاریخ گزرے ہوئے لمحوں کی دستاویز ہے ایسے لمحے جو ماضی بن گئے ہیں اور جن کے بارے میں معلومات مستقبل کے لئے معنویت اور رہبری فراہم کرسکتی ہے۔مورخ واقعات کی چھان بین کرتا ہے اور شاعر کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔تاریخ میں خارجی واقعات کا بیان ہوتا ہے جبکہ شاعری اندرونی جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کا فن ہے۔شاعر واقعات میں تخیل کی مدد سے ایک سماں پیدا کرتا ہے۔شاعری وہ کلام ہے جو جذباتِ انسانی کو اُکساتا ہے اور ان کو تحریک میں لاتا ہے۔شاعری میں جذبات یا احساسات الفاظ کے ذریعے ادا ہوتے ہیں۔

سوال: شاعری کے لیے شبلی کے نزدیک کون کون سی چیزیں ضروری ہیں؟

جواب: شبلی نعمانی اُردو ادب میں جمالیاتی تنقید کے علم بردار رہے ہیں۔وہ شعر وادب میں حسن کاری کو اصل شئے قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک شاعری دو چیزوں یعنی محاکات اور تخیل کا نام ہے۔محاکات سے زیادہ وہ تخیل کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس کو قوتِ اختراع یعنی نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قوت بتاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو دو قوتیں دی ہیں۔ایک ادراک اور دوسری احساس۔ادراک کا کام سوچنا،غور کرنا اور مسائل کو حل کرنا ہے۔احساس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی اثر انگیز واقعہ پیش آتا ہے تو وہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے،خوشی میں سرور ہوتا ہے،حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔یہی قوت جس کو احساس کہتے ہیں،شاعری کا دوسرا نام ہے۔یہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ان کے نزدیک ہر وہ چیز شاعری ہے جو ہمارے جذبات اور احساسات کو اُبھارے۔شبلی کے مطابق شاعری دیگر فنونِ لطیفہ(Fine Arts)سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔یعنی فنونِ لطیفہ جیسے موسیقی،مصوری،رقص،سنگ تراشی اور شاعری میں صرف شاعری ہی وہ فن ہے جس سے تمام حواس متاثر ہوتے ہیں جبکہ دیگر فنون سے ایسا کمال ممکن نہیں ہے۔

سوال: محاکات کسے کہتے ہیں؟

جواب: محاکات سے شبلی کی مراد کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح بیان کرنا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔گویا محاکات وہ شئے ہے جس کو ہم تصویر کشی یا آج کی زبان میں شعری پیکر کہتے ہیں۔

سوال: شبلی کی چند اہم تصانیف کا نام لکھئے۔

جواب: شبلی کے نثری،تنقیدی اور شعری کارناموں میں مندرجہ ذیل تصانیف شامل ہیں:۔

سیرت النبی ﷺ، شعر العجم، الغزالی، سوانح مولانا رومیؒ، الفاروق، الکلام، موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، مقالاتِ شبلیؔ، کلیاتِ فارسی، مجموعۂ نظم اُردو، علم الکلام، المامون، سیرتِ النعمان

سوال: تنقیدی صلاحیت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: اچھے بُرے میں فرق اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہر انسان میں کم یا زیادہ ضرور ہوتی ہے اگر یہ فرق کرنے کی تمیز انسان میں نہ ہو تو زندگی دُشوار ہو جائے گی۔فرق کرنے کی یہ صلاحیت ہی تنقیدی صلاحیت کہلاتی ہے۔

سوال: تنقید کسے کہتے ہیں؟

جواب: تنقید بنیادی طور پر ادب پر کھنے اور سمجھنے کے علاوہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔تنقید کے لغوی معنی کسی چیز کی چھان پھٹک اور جانچ پڑتال ہے۔ادبی اصطلاح میں تنقید بے لاگ جانچ پڑتال اور امتیازات کے جذبے سے بلند ہو کر تعین قدر کا نام ہے۔تنقید تحلیل و تجربہ، ترجمانی و تفسیر، ادراکِ حقیقت اور ادبی محاسبہ ہے۔اُردو میں تنقید کی باقاعدہ ابتدا حالؔی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ہوئی۔حالانکہ ان سے پہلے محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' اور اس سے بھی پہلے ''شعرائے اُردو کے تذکروں میں تنقید کے نشانات نظر آتے ہیں۔حالؔی، کے بعد شبلیؔ، عبدالحق، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ان کے بعد یہ روایت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

جانچ:

۱۔ شاعری اور سائنس میں کیا فرق ہے؟

۲۔ ادراک اور احساس کا کیا کام ہے؟

۳۔ تاریخ شاعری سے الگ کیسے ہے؟

۴۔ شبلی کے نزدیک شاعری کے اصلی عناصر کون کون سے ہیں؟

۵۔ شبلی نے محاکات کس کو کہا ہے؟

۶۔ تصویر اور محاکات میں کیا فرق ہے؟

درجِ ذیل اقتباس کو غور سے پڑھ کر اس کے آخر پر دئے گئے سوالات کے جواب لکھئے؛

''ان چند سطور میں شبلی انسانی حواس پر شاعری کے اثر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شاعری دیگر فنونِ لطیفہ کے مقابلے میں دل پر زیادہ اثر کرتی ہے۔موسیقی کے لئے مزہ حاصل کرنے کے لئے قوتِ سامعہ اور تصویر سے محظوظ ہونے کے لئے قوتِ باصرہ کا ہونا لازمی ہے جبکہ شاعری سارے حواس کو متاثر کرتی ہے۔اس کی تفصیل میں شبلی شراب اور بوسہ کی مثالیں دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب شاعر ان کی تشبیہہ کسی اور چیز سے دیتا ہے تو ان کا اثر بہت زیادہ رہتا ہے۔اس اقتباس کے لئے مناسب عنوان ''حواس پر شاعری کا اثر ہے''

سوالات

۱۔ ان سطور کو کوئی معقول عنوان دیجئے۔

۲۔ کون سی چیز دل پر زیادہ اثر کرتی ہے؟

۳۔ انسان کی مختلف قوتوں کے نام بتائے:

۴۔ موسیقی سے محظوظ ہونے کی کیا شرط ہے؟

کتابیات:

۱۔	نثری اصناف	ڈاکٹر محمد شارق
۲۔	تنقیدی نظریات	حصہ اول
۳۔	تنقید کیا ہے؟	پروفیسر آل احمد سرور مشمولہ نثری اصناف
۴۔	شعر العجم	شبلی نعمانی
۵۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین

مرغ بازی امین کامل

ترجمہ ترنم ریاض

تعارف :

ترجمے کا فن اتنا قدیم ہے جتنی کہ انسان کی سماجی زندگی۔ قدیم زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک دنیا میں رونما ہونے والی علمی، فنی، سائنسی اور تکنیکی معلومات ہمیں ترجموں کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ''پار لے جانا'' اُردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ عربی زبان سے آیا ہے۔ اہلِ لغت اس کے کم سے کم چار معنی درج کرتے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقلِ کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کے احوال کا بیان۔

ترجمہ کاری ایک مشکل فن ہے۔ ہر ایک زبان کا اپنا الگ محاوراتی نظام اور مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ الفاظ کے لغوی اور محاوراتی معانی ہوتے ہیں۔ اس سب کو پوری کامیابی کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے۔ تخلیقی ادب کا ترجمہ کرنا زیادہ ہی مشکل کام ہے۔ اس مشکل کے باوجود ترجمہ کاری کی بڑی اہمیت ہے۔ دنیا کی ہر ایک زبان میں ترجمہ کاری کا عمل جاری ہے۔ ایک زبان کا دامن دوسری زبانوں میں ہونے والے تخلیقی تجربات اور علمی اور ادبی سرمائے سے بھرنے کے لیے ترجمہ کاری بہت ضروری ہے۔

مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل مقاصد پورے ہونگے۔

۱۔ طالبِ علم ترجمہ نگاری کے فن سے واقف ہونگے۔

۲۔ طالبِ علم اردو کے ساتھ ساتھ کشمیری ادب کی وسعتوں کا بھی احاطہ کریں گے۔

۳۔ طالبِ علم ترجمہ کرنے کا ہنر سیکھیں گے۔

آموزشی ماحصل :

۱۔ طلاب ترجمہ کرتے ہیں۔

۲۔ طلاب اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت پر گفتگو کرتے ہیں۔

۳۔ طلاب مختلف زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کہانیاں پڑھتے ہیں۔

امین کاملؔ

حالاتِ زندگی

آپ کا نام محمد امین اور تخلص کاملؔ ہے۔ ادبی دُنیا میں امین کامل کے نام سے مشہور ہیں۔ ضلع کولگام کے ایک گاؤں کاپرن میں 1924ء میں تولد ہوئے۔ ایک مدت سے سری نگر میں سکونت پذیر ہیں۔ بی۔ اے تک تعلیم کشمیر میں پائی۔ علی گڑھ سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کر کے سرینگر میں وکالت کرنے لگے۔ دو سال اُردو لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا۔ 1958ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے شعبۂ کشمیری کے کنوینیر مقرر ہو گئے۔ اسی ادارے سے 1979ء میں ایڈیٹر کشمیری کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔

ادبی خدمات

امین کاملؔ کی ادبی زندگی کا آغاز اُردو زبان میں شعر گوئی سے ہوا۔ پہلے غریقؔ تخلص اختیار کیا تھا۔ آپ اُردو سے کشمیری کی طرف آئے لیکن اُردو میں بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔ آپ بہ یک وقت شاعر، محقق، مترجم، مرتب، نقاد، صحافی، ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈراما نگار ہیں۔ کشمیری زبان میں آپ کی تصانیف و تالیفات کی تعداد ڈیڑھ درجن سے زیادہ ہے۔ آپ کو زبان و ادب کی خدمات کے صلے میں کئی بار انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ ان اعزازات میں کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ کے علاوہ، فاخرہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور پدم شری ایوارڈ بھی شامل ہیں۔ آپ کے شعری مجموعہ ''یم میانی سوخن'' کو جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کی جانب سے 2009ء کی بہترین کشمیری کتاب ہونے کا اعزاز عطا کیا گیا۔

امین کاملؔ کی افسانہ نگاری

امین کامل کشمیری زبان کے ایک برگزیدہ افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانے اپنے دور کی تلخیاں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہر ایک افسانہ کشمیری مزاج، کلچر اور روایات کا آئینہ دار ہے۔ امین کامل اپنے افسانوں کے کرداروں کی نفسیات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ آپ نے کشمیری زبان کے افسانوی ادب کو کچھ کرداروں کی نفسیات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ان کے افسانوں میں طنز کا عنصر موجود ہے۔ امین کامل کے کشمیری افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کتھِ منز کتھ'' 1954ء میں شائع ہوا تھا۔

ترنم ریاض

ترنم ریاض 1963ء کو سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ آپ ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعرہ ہیں۔ ایک ہونہار تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار ترجمہ کار بھی ہیں۔ آپ کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ جن میں یہ تنگ زمین، یمبر زل (افسانے)، مورتی (ناول)، فریبِ خطۂ گل (ناول)، برف آشنا پرندے (ناول)، پرانی کتابوں کی خوشبو، چشم قدم، صحرا ہماری آنکھ میں (شعری مجموعے) وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اُردو زبان و ادب کی خدمت کے صلے میں ترجم ریاض کو کئی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ جن میں ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ 2005ء اور دہلی اُردو اکیڈیمی ایوارڈ 2006ء قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی اُردو تصنیف ''میرا رختِ سفر'' کو جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز نے 2009ء کی بہترین اُردو کتاب کے اعزاز سے نوازا ہے۔

نصابی سوالات

سوال: افسانے میں چند ایسے محاورات تلاش کیجئے جو مستورات سے مخصوص ہیں۔

جواب: افسانے میں جو محاورات مستورات سے مخصوص ہیں وہ درج ذیل ہیں:

نمبر شمار	محاورے	نمبر شمار	محاورے	نمبر شمار	محاورے	نمبر شمار	محاورے
۱	بچے نے گیلا کر دیا	۲	ہانڈی چڑھا کر رکھنا	۳	قینچی کی طرح زبان چلنا	۴	زبان حرکت میں آنا
۵	بدن میں آگ لگنا	۶	زبان کی جنگ ہونا	۷	پسینے سے شرابور ہونا	۸	طوفان کھڑا کرنا

سوال: غلام خان کے ہاتھ میں مرغا دیکھ کر شاہ مال کیوں خوش ہوگئی؟

جواب: غلام خان کے ہاتھ میں مرغا دیکھ کر شاہ مال خوشی سے پھولے نہ سمائی جسے اُس کے خاوند نے مائسمہ کے بازار سے تین روپے میں خریدا تھا۔شاہ مال کے دل کی مراد پوری ہوگئی کیونکہ اُس کے پاس مرغیاں تو تھیں لیکن کوئی مرغا نہیں تھا۔اُسے اِسی طرح کے مرغے کی تلاش تھی۔وہ اس مرغے کی بدولت اپنی پڑوسن کو طعنے دے کر نیچا دکھانا چاہتی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ شاہ مال کو مرغا مریل جانی کو جلانے کے لئے ہی چاہیے تھا۔

سوال: شاہ مال کے مرغے کا حلیہ کیسا تھا؟

جواب: شاہ مال کے مرغے کا رنگ سفید برّاق تھا۔اُس کی ٹانگیں پتلی مگر چال شاندار تھی۔وہ سات ماہ کا لگتا تھا۔وہ عمدہ نسل کا دکھتا تھا۔

سوال: مریل جانی کے مرغے کا حلیہ کیسا تھا؟

جواب: مریل جانی کے مرغے کا رنگ سُرخ تھا۔اُس کے پروں پر جا بجا ننھے ننھے سیاہ دھبے تھے۔وہ اپنی مضبوط ٹانگوں کے باعث طاقت ور نظر آرہا تھا۔وہ بھی اچھی نسل کا مرغا تھا۔

سوال: شاہ مال مریل جانی کے مرغے کے ساتھ کیا سلوک کرتی تھی؟

جواب: شاہ مال مریل جانی کے مرغے کے ساتھ نہایت ہی بُرا سلوک کرتی تھی۔وہ اپنی مرغیوں کے لئے کوئی مرغا نہ ہونے کی وجہ سے اُس کا اپنے صحن میں آنا پسند کرتی تھی مگر جب وہ دھوپ میں اناج سُکھانے کے لئے پھیلاتی تو اُسے مریل جانی کے مرغے کا آنا بہت بُرا لگتا تھا کیونکہ وہ اناج چگنے اور بکھیر دینے سے باز نہ آتا تھا۔اس وجہ سے شاہ مال کو غصہ آتا تھا اور وہ مرغے کو بہت بُرا بھلا کہتی تھی۔

سوال: شاہ مال نے اپنا مرغا ذبح کروانے کا ارادہ کیوں کیا؟

جواب: شاہ مال نے بڑے شوق سے گھر میں مرغا منگوایا تھا وہ اُس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی لیکن جب مرغے نے بے وقت بانگ دے دی جس کی وجہ سے شاہ مال کو کافی پریشانی ہونے لگے۔وہ اسے منحوس سمجھنے لگے اور اسے اپنی پڑوسن مریل جانی سے طعنے بھی سننے پڑے۔اس لئے اُس نے مرغا ذبح کروانے کا ارادہ کرلیا۔

سوال: شاہ مال نے مرغا ذبح کیوں نہیں کروایا؟

جواب: شاہ مال جب صمد قصائی سے مرغا حلال کروانے کا وعدہ لے کر گھر لوٹی تو دیکھا کہ اُس کا مرغا مریل جانی کے مرغے کے ساتھ لڑ رہا ہے اور اُس نے بڑی دلیری کے ساتھ مریل جانی کے مرغے کو زیر کرلیا ہے۔شاہ مال نے دیکھا کہ اُس کے مرغے میں جنگجوانہ صلاحیتیں موجود ہیں بھلے ہی وہ رات میں ہی بانگ دیتا ہے۔شاہ مال کو اپنے مرغے پر فخر ہونے لگا اور اُس نے مرغا ذبح کروانے کا اِرادہ ترک کر دیا۔

سوال: درج ذیل کرداروں میں سے آپ کو کون سا کردار زیادہ پسند آیا اور کیوں؟ شاہ مال، مریل جانی۔سفید مرغا۔سُرخ مرغا

جواب: افسانہ ’’مرغ بازی‘‘ میں شامل سارے کردار عمدہ ہیں مگر ان میں شاہ مال کا کردار سب سے جاندار اور دلچسپ ہے۔اُس میں گھریلو عورت کے

سارے صفات موجود ہیں۔ وہ بہت ہی سیدھی اور کشمیر کی عام گھریلو خاتون ہے۔ اُس کے کردار سے کشمیر کی تہذیب اور روایت کی عکاسی ہوتی ہے۔ اُس سے اپنی بے عزتی برداشت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی پڑوسن کو نیچا دکھانے کے لئے منحوس مرغے کو بھی پالنے کے لئے تیار ہوتی ہے۔

سوال: ''مرغ بازی'' افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے۔

جواب: ''مرغ بازی'' امین کامل کا ایک نمائندہ کشمیری افسانہ ہے جس کا ترجمہ ترنّم ریاض نے اُردو زبان میں کیا ہے۔ غلام خان بازار سے ایک مرغا خرید کر گھر لے آتا ہے جسے دیکھ کر اُس کی بیوی شاہ مال خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ وہ مرغے کو آنگن میں چھوڑ کر اونچی آواز میں کہتی ہے کہ مجھے اسی قسم کے مرغے کی تلاش تھی۔ دراصل وہ اپنی پڑوسن مریل جانی کو نیچا دکھانے کے لئے طعنہ دے رہی تھی۔ شاہ مال کے پاس پہلے سے ہی دو مرغیاں تھیں لیکن اب وہ مرغیوں کے مقابلے میں مرغے کا زیادہ خیال رکھنے لگے۔ جب مریل جانی نے شاہ مال کے آنگن میں مرغا دیکھا تو وہ اُسے مبارک باد دیتی ہے۔ شاہ مال نے اِتراتے ہوئے کہا کہ ہم نے اسے ساڑھے چار روپے میں خریدا ہے اور یہ عمدہ نسل کا ہے۔ مریل جانی سے شاہ مال کے طعنے برداشت نہیں ہوتے ہیں وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ جب شاہ مال کے پاس اپنی مرغیوں کے لئے کوئی مرغا نہیں تھا تو وہ مریل جانی کے مرغے کو اپنے صحن میں آنے دیتی تھی لیکن جب وہ اناج چگنے لگتا تھا تو وہ اُسے بہت کوستی تھی جس پر مریل جانی کو غصّہ آتا تھا۔

شاہ مال کو اپنے مرغے پر بڑا ناز تھا لیکن جب مرغ نے ایک رات کو وقت سے پہلے بانگ دی تو وہ مرغے کو منحوس سمجھنے لگی اور غلام خان سے ضد کرنے لگی کہ اس مرغے کو حلال کروائیں کیونکہ مرغے کی بے وقت بانگ اُس کی پڑوسن مریل جانی نے بھی سُنی ہوگی جس کی وجہ سے اب اُسے طعنے سُننے پڑیں گے۔ شاہ مال نے مرغا ذبح کروانے کا مکمل ارادہ کر لیا اور اسی نیت سے وہ صمد وقصائی کے گھر جا کر اُس سے مرغا حلال کروانے کا وعدہ لے کر گھر لوٹی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا مرغا مریل جانی کے مرغے کے ساتھ لڑ رہا ہے اور اُس کے مرغے نے بڑی دلیری کے ساتھ مریل جانی کے مرغے کو زیر کر لیا ہے۔ شاہ مال نے دیکھا کہ اُس کے مرغے میں جنگجوانہ صلاحیتیں موجود ہیں وہ اس بات کو بھول گئی کہ اُس کا مرغا منحوس ہے۔ اُسے اپنے مرغے پر فخر ہونے لگا اور اُس نے مرغا ذبح کروانے کا اِرادہ ترک کر دیا۔

سوال: درجِ ذیل محاورات کے معانی لکھئے۔

جواب:

نمبر شمار	محاورے	معنی
1	خوشی سے پھولے نہ سمانا	نہایت خوش ہونا
2	ٹھٹھک جانا	حیران ہو کر ٹھہر جانا
3	خون کھول اُٹھنا	بہت غصّہ آنا
4	دل ہلکا ہونا	دل کا بوجھ کم ہونا
5	دل ڈوب جانا	کمزوری کی وجہ سے دل گرنا
6	چہرے کا رنگ اُڑنا	پریشان ہونا

جانچ :

درجِ ذیل اقتباس کو پڑھ کر اس کے آخر پر دئے گئے سوالات کے جواب لکھئے۔

’’شاہ مال کو اپنے مرغے پر بڑا ناز تھا لیکن جب مرغ نے ایک رات کو وقت سے پہلے بانگ دی تو وہ مرغے کو منحوس سمجھنے لگی اور غلام خان سے ضد کرنے لگی کہ اس مرغے کو حلال کروائیں کیونکہ مرغے کی بے وقت بانگ اُس کی پڑوسن مریل جانی نے بھی سُنی ہوگی جس کی وجہ سے اب اُسے طعنے سُننے پڑیں گے۔شاہ مال نے مرغا ذبح کروانے کا مکمل ارادہ کرلیا اور اسی نیت سے وہ صمد وقصائی کے گھر جا کر اُس سے مرغا حلال کروانے کا وعدہ لے کر گھر لوٹی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا مرغا مریل جانی کے مرغے کے ساتھ لڑ رہا ہے اور اُس کے مرغے نے بڑی دلیری کے ساتھ مریل جانی کے مرغے کو زیر کرلیا ہے۔ شاہ مال نے دیکھا کہ اُس کے مرغے میں جنگجوانہ صلاحیتیں موجود ہیں وہ اس بات کو بھول گئی کہ اُس کا مرغا منحوس ہے۔اُسے اپنے مرغے پر فخر ہونے لگا اور اُس نے مرغا ذبح کروانے کا اِرادہ ترک کردیا۔‘‘

سوالات

۱۔ شاہ مال نے مرغے کو منحوس کیوں سمجھا؟

۲۔ اُس کو کس بات کا ڈر تھا؟

۳۔ جانی کی پڑوسن کا نام بتائیے۔

۴۔ کس نے مرغے نے جنگ جیتی؟

۵۔ مشہور قصائی کا نام کیا تھا؟

مختصر جواب لکھئے

۱۔ امین کامل پر پانچ جملے لکھئے۔

۲۔ ترنم ریاض کی تین کتابوں کے نام لکھئے۔

۳۔ جانی کے کردار کے بارے لکھئے۔

۴۔ غلام خان کیسا مرد تھا؟

کتابیات

۱۔	فنِ ترجمہ، اصول ومبادیات	حسن عسکری
۲۔	اردو میں ترجمی کی روایت اور اس کا فن	عارف عزیز
۳۔	بیسویں صدی میں خواتین کا ادب	ترنم ریاض
۴۔	کوکر جنگ (افسانہ)	امین کامل
۵۔	کاشرِ ادبک تواریخ	ناجی منور، شفیع شوق
۶۔	کشمیری زبان اور شاعری	عبدالاحد آزاد

یونیسکو کی چتھری

مجتبیٰ حسین

تمہید:

کیا آپ نے کبھی سفر کیا ہے؟ کیا آپ کبھی اپنی بستی یا اپنے ملک سے باہر کسی دوسری بستی یا ملک میں گئے ہیں؟ اگر گئے ہیں تو آپ نے وہاں کیا دیکھا؟ آپ یقیناً وہاں کے لوگوں سے ملے ہوں گے، وہاں کے پکوان کھائے ہوں گے، وہاں کی عمارتوں کو دیکھا ہوگا، وہاں کی پارکوں، ہوٹلوں اور سیاحتی مقامات پر گئے ہوں گے۔ آپ نے بہت دیکھا ہوگا۔ گھر واپس آنے کے بعد آپ نے دورانِ سفر میں دیکھی ہوئی مختلف چیزوں، اشخاص یا واقعات گھر کے لوگوں اور دوستوں کو سنائے ہوں گے۔ اگر آپ یہی واقعات کاغذ پر لکھیں گے تو یہ سفر نامہ بن جائے گا۔ سفر نامہ اُردو ادب کی مشہور اور خوبصورت صنف ہے۔ ذیل میں سفر نامہ کے بارے میں جانکاری دی جاتی ہے۔

مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے مندرجہ ذیل مقاصد حاصل ہوں گے

۱۔ طالبِ علموں کو سفر نامہ کے فن اور تاریخ کا علم ہوگا۔

۲۔ طالبِ علم ادبی مزاح کے اصولوں سے واقف ہوں گے۔

۳۔ طالب علم اپنی مختصر سفری تفصیلات لکھنے کے اہل ہوں گے۔

۴۔ طلاب مجتبیٰ حسین اور اُن کی قبیل کے مزاح نگاروں کے متعلق لکھ سکیں گے۔

آموزشی ما حصل:

۱۔ طلاب سفر نامہ کے فن اور اس کی تاریک پر بحث ومباحثہ کرتے ہیں۔

۲۔ طلاب مزاح نگاری کے متعلق مضامین لکھتے ہیں۔

۳۔ طلاب اپنی سفری تفصیلات مختصر مگر ادبی تقاضوں کے مطابق لکھتے ہیں۔

۴۔ طالبِ علم سفرنامے پڑھنے کے بعد ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔

۵۔ طلاب مجتبیٰ حسین اور دوسرے مزاح نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

تعارف:

سفر نامہ

سفر نامہ سفر کے تاثرات، حالات، کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتامِ سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔

سفر نامہ سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کا نام ہے۔ چنانچہ اس میں چھوٹے سے چھوٹا اور معمولی واقعہ بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ بیان کئے گئے واقعات غیر معمولی بھی ہوسکتے ہیں اور عام زندگی سے تعلق رکھنے والی باتیں بھی ہوسکتی ہیں تاہم سفر نامہ نگار ان واقعات کو اپنے گہربار قلم سے اس خوبصورتی سے پیش کرتا ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ سفر نامہ نگار کے ساتھ سفر کرنے کا حظ اُٹھا رہا ہے۔

سفر نامے میں سفر نامہ نگار کی شخصیت کے متنوع پہلو بھی تحریر میں آجاتے ہیں۔ وہ ان پہلوؤں کو قصداً بیان نہیں کرتا بلکہ مختلف واقعات کو بیان کرنے

کے دوران میں اُس کی زندگی سے جڑی ہوئی باتیں آپ سے آپ چھلک پڑتی ہیں۔اس طرح سفرنامہ میں آپ بیتی کا رنگ بھی شامل ہوجاتا ہے۔سفرنامہ ایک داستان کی طرح ہوتا ہے جس میں واقعات اپنی فطری رفتار سے جنم لیتے ہیں۔اس میں کہانی بھی ہوتی ہے اور ڈرامے کی سی منظرنگاری بھی۔ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے سفرنامے ''دیکھ لے ایران'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''سفرنامے کی صنف میں تمام اصناف کو اکٹھا کردیا جاتا ہے۔اس میں داستان کا داستانوی طرز، ناول کی افسانہ طرازی، ڈرامے کی منظرکشی، آپ بیتی کا مزہ، جگ بیتی کا لطف اور سفر کرنے والا خود تماشا ہوکر اپنے تاثرات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی تحریر پُرلطف بھی ہوجاتی ہے اور معلومات افزا بھی۔''

اُردو میں سب سے پہلا سفر یوسف خان کمبل پوش نے ''سفرنامہ۔عجائب فرنگ'' کے نام سے لکھا۔پھر سرسید نے انگلستان کے سفر کے واقعات و تاثرات تحریر کرکے ہندوستان میں شائع کئے۔علامہ شبلی نے 1892ء میں مصر، شام اور ترکی کا سفر کیا۔اپنے مشاہدات کو سفرنامے کی شکل میں پیش کیا۔یہ سفرنامہ خاصا مشہور ہوا۔مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ''سفرنامہ ایران'' لکھا۔

بیسویں صدی میں سفرنامہ نے ایک نئی جست لگائی۔اب سفرنامہ محض واقعات کی کھتونی نہ رہا بلکہ سماجی، سیاسی، اخلاقی، نفسیاتی عناصر کو بھی اپنے اندر سمیٹنے لگا۔جیسے سفرنامہ 1900ء کا یورپ، از محبوب عالم، بعض سفرناموں میں مزاحیہ عناصر شامل ہوتے ہیں جو قاری کو معلومات کے ساتھ مسرت بھی بخشتے ہیں ان میں مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ ''جاپان چلو، جاپان چلو'' شامل کیا جاسکتا ہے۔جسٹس تقی عثمانی نے اپنے اسفار کو تین مختلف عناوین کے ساتھ شائع کیا۔جہانِ دیدہ، دنیا میرے آگے اور سفر در سفر۔''

یہ مرتب قسم کے سفرنامے ہیں جو ایک کہنہ مشق و مفکر کے مشاہدات، تجربات، تاثرات اور علمی فتوحات پر مشتمل ہیں۔بعض سفرنامے خالص مذہبی جذبے کی پیداوار ہیں جیسے ممتاز مفتی کا ''لبیک''، ''دو مہینے امریکہ میں'' یہ سفرنامہ محمد رابع ندوی کا ہے اس میں امریکہ کی تہذیبی اور اخلاقی صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔''سیاحتِ ماجدی'' یہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے اندرون اور بیرونِ ملک کئے گئے اسفار کی نہایت دلچسپ اور دلآویز روئیداد ہے۔

اُردو میں جعلی سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں۔ان میں فرحت اللہ بیگ کا سفرنامہ ''سماٹرا'' شامل ہے۔وہ سماٹرا کبھی نہیں گئے لیکن انہوں نے محض سنی یا پڑھی ہوئی معلومات کی مدد سے جو سفرنامہ ترتیب دیا ہے وہ اُن کے ذوقِ جمالیات اور قوتِ تخیل کی عکاسی کرتا ہے۔

اب تک سینکڑوں سفرنامے منظرعام پر آچکے ہیں۔سفرناموں کا یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔جب تک باذوق ادباء اور اہلِ قلم دنیا کی سیر کرتے رہیں گے سفرنامے بھی وجود میں آتے رہیں گے۔

آپ نے کیا سیکھا؟

۱۔ انسان کسی جگہ کی سیر کرتا ہے تو اُس کے واقعات ضرور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سُناتا ہے۔

۲۔ سفرنامہ، سفر کے دوران میں پیش آنے والے واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کا نام ہے۔

۳۔ سفرنامہ میں سفرنامہ نگار کی اپنی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

۴۔ سفرنامہ میں داستان، افسانہ، ناول، آپ بیتی، جگ بیتی اور ڈرامے کی چاشنی بیک وقت پائی جاتی ہے۔

۵۔ اُردو کا پہلا سفرنامہ محمد یوسف خان کمبل پوش کا ''عجائب فرنگ'' ہے۔

۶۔ سفرناموں کا سفر تاہنوز جاری ہے۔

بنیادی موضوع:

مجتبیٰ حسین جب جاپان کے سفر پر جاتے ہیں تو اپنی بیوی کو لکھتے ہیں کہ دوسرے ہی دن وہ (چھتری) مجھے مل گئی۔لیکن خط میں وہ ''چھتری'' لکھنا بھول جاتے ہیں اور اُن کی بیوی اس کو کوئی خاتون سمجھتی ہے۔ بیوی رات کے ڈیڑھ بجے فون کرتی ہے اور انہیں کوستی ہے، بُرا بھلا سناتی ہے کہ وہ کسی اجنبی عورت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

مصنف لاکھ سمجھاتے ہیں کہ یہ یونسکو کی چھتری ہے جو انہیں مندوب ہونے کی حیثیت سے دوسرے ہی دن دی گئی لیکن مصنف کی بیوی کا شک دور نہیں ہوتا۔وہ غصے سے فون رکھ دیتی ہے۔مصنف اس صورت حال سے پریشان ہو جاتا ہے۔وہ اپنی بیوی سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے لیکن اُس کی بیوی اُسے فضول باتوں میں اُلجھا کر فون کا جاری بل چڑھاتی ہے۔

یہ چھتری مصنف کو ٹوکیوں میں یونیسکو کی عہدہ دار مس جو نے دی تھی۔دیتے وقت کہا تھا کہ یہ چھتری یونیسکو کی ملکیت ہے اس لئے جاپان سے چلے جانے کے وقت اسے لوٹانا ہوگا۔ٹوکیو میں کثرت سے بارش ہوتی ہے لہٰذا چھتری ساتھ رکھنی پڑتی ہے۔اس کے برعکس مصنف کا تعلق اُس ملک سے ہے جہاں بارش کم ہوتی ہے۔مصنف چھتری ساتھ رکھنے کے عادی نہیں،اس لئے بار بار اسے بھول جاتے ہیں۔

کانفرنس کے روم میں زور کا جھٹکا آتا ہے۔یہ جاپان کے باشندوں کے لئے عام سی بات ہے لیکن مصنف چھتری چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ایک جاپانی انہیں پکار کر کہتا ہے کہ زلزلوں کے وقت یہاں چھتری چھوڑ کر بھاگنا منع ہے۔سیمینار کے دوسرے مندوب بھی ہراساں تھے۔لیکن سری لنکا کے مسٹر جیا کوڑی کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہو گئے۔انہوں نے گھبراہٹ میں چھتری کھول دی۔زلزلے کا جھٹکا تھما تو مصنف مس جو سے کہتا ہے کہ ہمیں آسمانی بلاؤں سے کوئی ڈر نہیں۔ہمیں ایسی چھتری دیجئے جو زمینی بلاؤں سے ہمیں محفوظ رکھے۔

جاپان ترقی یافتہ ملک ہے۔آپ نے ایسی کوئی چھتری ضرور ایجاد کی ہوگی۔اس پر مس جو مسکراتی ہے اور چلی جاتی ہے۔

مصنف کو جاپان دیکھنے کا بہت شوق ہے لیکن اُن کا یہ شوق پورا نہیں ہو پاتا۔اس لئے کہ چھتری کی وجہ سے ان کو ہمیشہ ایک مقام پر دوبارہ جانا پڑتا ہے۔ایک بار اس مقام کو دیکھنے کیلئے اور دوسری بار بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے کیلئے۔جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں بھی دو بار گئے۔ایک مرتبہ وہاں ان کا خیر مقدم ہونے والا تھا اور دوسری بار چھتری کو واپس لانے کیلئے اگر چہ تھائی لینڈ کی مندوب مس پرینیا کا خیال ہے کہ مصنف جان بوجھ کر وہاں چھتری چھوڑ آئے تھے تاکہ دوسری بار جانے کا کا موقع مل سکے۔مصنف دوسری مرتبہ بھی اس چھتری کو وہیں چھوڑ کر جا رہے تھے البتہ یونیورسٹی کے ایک عہدے دار نے اُن کو یاد دلایا کہ وہ اپنی چھتری بھول رہے ہیں۔

مصنف جہاں بھی جاتے ہیں چھتری بھول آتے ہیں۔پھر اس کو واپس لانے کیلئے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔اس بھاگم بھاگ میں ایک بار دیکھا کہ ان کے کمرے پر ایک نوجوان جوڑے نہ قبضہ کر لیا ہے۔اس چھتری کی وجہ سے مصنف کو بہت خفت اُٹھانی پڑی۔رات کو اچانک نیند کھل جاتی ہے اور چھتری تلاش کرنے لگتے ہیں۔ایک بار چھتری کو اسٹینڈ میں بھول گئے اور اسٹینڈ کی کنجی گھمادی۔اسٹینڈ والے کو فاضل کنجی کا استعمال کرنا پڑا۔اس چھتری کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی پریشان ہوتے تھے۔یہاں تک کہ جب سب مندوبین گاڑی میں بیٹھتے تو ڈرائیور پوچھتا۔مسٹر حسین کی چھتری آ گئی کیا؟

جاپان میں اگر چہ بارش بہت ہوتی ہے تاہم اس بار صرف دو مرتبہ بارش ہوئی۔ایک بار بارش ہوئی تو مصنف کو چھتری کھولنی نہیں آئی۔ایک جاپانی کی مدد حاصل کرنا پڑی۔چھتری کو دوبارہ واپس لانے کیلئے مصنف کو بڑی رقم خرچ کرنا پڑی۔ایک بار بازار میں چھتری کی قیمت پوچھی تو معلوم ہوا کہ ایک ہزار این کی ہے جبکہ اس چھتری کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ٹیکسیوں اور ٹرینوں میں پانچ ہزار ین خرچ ہو چکے تھے۔

ہندوستان لوٹتے وقت مِس جو مصنف سے کہتی ہے کہ اب آپ ہندوستان میں اپنی بیوی کو ویسے ہی ساتھ رکھیے جیسے آپ یہاں اس چھتری کو ساتھ رکھتے تھے۔مِس جو چھتری کے مٹھ سے وہ ٹیپ چھیل دیتی ہے جس پر مصنف کا نام لکھا ہے۔مصنف کے دل پر بجلی سی گرتی ہے وہ تڑپ کر بول اُٹھتے

ہیں۔ مِس جُو اس چھتری پر سے ہمارا نام ذرا آہستہ سے نکالیے۔ دل پر چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ مصنف سچ مچ رو پڑتے ہیں۔ ہندوستان واپس پہنچنے کے بعد بھی مصنف اس چھتری کو نہیں بھولتے۔ اُسے یاد کرتے رہتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین

حالاتِ زندگی:

مجتبیٰ حسین کا آبائی وطن راجوری ضلع عثمان آباد مہاراشٹر ہے۔ اُن کی ولادت 15 /جولائی 1936ء کو ان کے ننھیال گلبرگہ کرناٹک میں ہوئی۔ والد کا نام مولوی احمد حسین تھا۔ مجتبیٰ حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر گلبرگہ کے مدرسہ میں چوتھی جماعت میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد عثمان آباد میں بھی کچھ عرصہ زیرِ تعلیم رہے۔ تانڈور ہائی اسکول آندھرا پردیش سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ پھر 1953ء میں گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے کیا اور وہیں سے 1958ء میں پبلک ایڈمنسٹریشن میں ڈپلوما بھی کیا۔

1956ء میں مجتبیٰ حسین روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ 1972ء میں اُردو مسائل کا جائزہ لینے کے لیے بنائی گئی گجرال کمیٹی کے ساتھ کام کرنے کے لیے اُنہیں دہلی بلایا گیا تو اُنہوں نے اپنے ظریفانہ انداز سے دہلی کی ادبی محفلوں کو زعفران زار بنایا۔

مجتبیٰ حسین کا تقرر 1972ء کے اواخر میں NCERT میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوا۔ 1979ء میں ایڈیٹر مقرر ہوئے اور 1991ء میں اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ آج کل تندہی اور لگن کے ساتھ تخلیقی کام میں مصروف ہیں۔

طرزِ تحریر:

مجتبیٰ حسین کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ وہ طنز و مزاح نگار، انشائیہ نگار، مرقع نگار اور سفرنامہ نگار ہونے کے علاوہ صحافی اور انشا پرداز بھی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی زباں رواں، سلیس اور صاف ہے۔ اپنے طنز و مزاح میں نرم اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ سیدھے سادھے الفاظ سے آدمی کو گدگداتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے لکھنے کا انداز برجستہ اور بے ساختہ ہے۔ وہ نہ کسی خاص ماحول اور مزاج کے پابند ہیں اور نہ کسی وقت اور موضوع کے۔ بلکہ وہ کسی خاص صنف کے بھی پابند نہیں ہیں۔

ادبی کارنامے:

مجتبیٰ حسین کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا، جن میں 2007ء میں پدم شری ایوارڈ بھی شامل ہے۔ مجتبیٰ حسین بہت سی ادبی انجمنوں کے جنرل سکریٹری رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی ادبی اور تخلیقی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہی ہوا۔ وہ اپنے کالج کی طلبہ یونین کے بزم اُردو کے جنرل سکریٹری رہے، وہ اچھے گلوکار اور اداکار بھی تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی بزم ادب کے بھی جنرل سکریٹری بنے۔ روزنامہ سیاست، میں پہلے صحافی پھر شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد کالم نویس بن گئے۔ اس طرح اُن کی مزاح نگاری کی بھی ابتدا ہوئی۔ انہوں نے اپنی ادبی سرگرمی کی وجہ سے جاپان، برطانیہ، فرانس، کینیڈا، امریکہ، روس اور سعودی عربیہ کا سفر کیا۔ سبکدوشی کے بعد ''سیاست''، ماہنامہ ''شگوفہ'' اور ماہنامہ ''کتاب نما'' میں اُن کے مضامین پابندی سے چھپتے ہیں۔ اُن کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں: تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہرحال، جاپان چلو، جاپان چلو، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، ہوئے ہم دوست جس کے، آپ کی تعریف وغیرہ وغیرہ۔

نصابی سوالات

سوال: مصنّف نے بیوی کو خط میں کیا لکھا؟

جواب: مصنف نے بیوی کو خط میں لکھا کہ وہ ہمیں آج ملی ہے۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کو رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں اور اسی کے سائے میں رہنا ہے۔

سوال: مصنف اور اس کی بیوی کے درمیان ہوئی بات چیت کو اپنے الفاظ میں لکھئے۔

جواب: مصنف کی بیوی خط پڑھ کر بہت غصہ ہوگئی وہ یہ سمجھی کہ جس کا ذکر خط میں ہوا ہے وہ یقیناً کوئی لڑکی ہے۔ اُس نے آٹھ دن بعد ٹوکیو اپنے خاوند کو فون کر کے ناراضگی کا اظہار کیا۔ مصنف سمجھ گیا کہ اُن کی بیوی خط کی وجہ سے خفا ہے۔ مصنف کی بیوی کو شک ہے کہ اس کے خاوند کے ساتھ اس وقت کمرے میں وہی ہے جس کا ذکر خط میں تھا۔ مصنف اپنی بیوی کو بہت یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس وقت اپنے کمرے میں بالکل اکیلے ہیں اور نیند کی وجہ سے اُس کی آواز میں خمار ہے۔ مگر بیوی کو بالکل یقین نہیں آتا ہے۔ مجتبیٰ حسین جب اُس کو کہتے ہیں کہ جس کو تم لڑکی سمجھ رہی ہو وہ حقیقت میں چھتری ہے مگر اُس کی بیوی پھر بھی اعتبار نہیں کرتی ہے اور غصّے میں بہت زور سے فون رکھ دیتی ہے۔

سوال: سمینار کے کچھ اور مندوبین کے نام لکھئے۔

جواب: شری لنکا کے مسٹر جیا کوڈی اور تھائی لینڈ کی مِس پرینا وہ دوسرے مندوبین ہیں جو یونیسکو کے سمینار میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔

سوال: مصنف جاپان کو اطمینان کے ساتھ کیوں نہیں دیکھ سکا؟

جواب: یونیسکو کی چھتری کی وجہ سے مصنف کو جاپان میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس چھتری کی وجہ اُس کی بیوی اُن سے خفا ہوگئی۔ وہ جہاں جاتے تھے یہ چھتری وہیں بھول جاتے تھے اور اس چھتری کو حاصل کرنے کے لئے دوبارہ وہاں جانا پڑتا تھا جس کی وجہ سے اُنہیں کافی خرچہ بھی برداشت کرنا پڑا۔

سوال: یونیسکو میں مصنف کو دوسرے دن کیا ملا تھا؟

جواب: یونیسکو میں مصنف کو دوسرے دن چھتری ملی تھی۔

سوال: مصنّف جاپان کیوں گیا تھا؟

جواب: مصنف ایک مندوب کی حیثیت سے یونیسکو کے سمینار میں شرکت کی غرض سے گیا تھا۔

سوال: چھتری پر مصنف کا نام کس طرح لکھا گیا تھا؟

جواب: پلاسٹک کی بنی ہوئی چھتری پر مصنف کا نام گم ٹیپ سے چپکایا گیا تھا۔

سوال: مصنف کو کس کس جگہ پر چھتری ڈھونڈنے کے لئے دوبارہ جانا پڑا؟

جواب: جاپان ریڈیو اسٹیشن، زنانہ یونیورسٹی، یوکوہاما، اومیا اور نارا کیوٹو وہ مقامات ہیں جہاں مصنف کو چھتری ڈھونڈنے کے لئے دوبارہ جانا پڑا۔

سوال: چھتری کی قیمت کتنی تھی؟

جواب: چھتری کی کُل قیمت ایک ہزار ین تھی۔

سوال: چھتری ڈھونڈنے میں مصنف کا کُل کتنا نقصان ہوا تھا؟

جواب: چھتری ڈھونڈنے میں مصنف کو کُل پانچ ہزار ین کا نقصان ہوا تھا۔

سوال: مصنف جاپان میں کتنے دن رہا؟

جواب: مصنف نے جاپان میں کُل ۳۵ دن گزارے۔

سوال: کس نے کہا، کس سے کہا اور کیوں کہا؟

۱۔میری خیریت جائے بھاڑ میں، پہلے یہ بتاؤ اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے۔

جواب: مصنف کی بیوی نے اپنے خاوند مجتبیٰ حسین کو فون پر کہا۔ دراصل اُسے خط کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے اسلئے وہ زبردست غصے میں ہے اور یہ سوچ رہی کہ مجتبیٰ حسین جاپان میں کسی لڑکی کے ساتھ ہیں۔

۲۔بھلا چھتریوں کی بھی کہیں شادی ہوتی ہیں۔

جواب: مجتبیٰ حسین اپنی بیوی کو فون پر جواب دیتے ہیں۔اصل میں بیوی کو شک ہے کہ جس چھتری کے بارے میں مجتبیٰ حسین نے ذکر کیا ہے وہ ضرور کوئی لڑکی ہے اور اس لئے وہ اُسے پوچھتی ہے کہ چھتری کی شادی ہوئی یا نہیں۔

۳۔میں کل ہی جاپان سے چلا جاؤں گا، مجھے ایسا دہلانے والا سمینار نہیں چاہیے۔

جواب: یہ جملہ سری لنکا کے مندوب مسٹر جیا کوڈی نے اُس وقت کہا جب اجلاس کے وقت زلزلے کے جھٹکے اُنہوں نے محسوس کئے۔

۴۔اب آپ ہندوستان جاکر اپنی بیوی کو بھی اسی طرح ساتھ رکھیں گے جس طرح یہاں چھتری کو رکھا کرتے تھے۔

جواب: یہ یونیسکو کی عہدہ دار مس جونے مجتبیٰ حسین سے کہا کیونکہ جاپان میں اُنہوں نے اس چھتری کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اسلئے مس جونے ایسا مزاق کے طور پر کہا۔

۵۔کیا عجب کہ اب کی بار ہم بادل بن کر تجھ پر برسنے آجائیں۔

جواب: جب مجتبیٰ حسین اپنے گھر لوٹ آئے تو جاپان کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اُنہوں نے چھتری کی محبت میں یہ جملہ کہہ دیا جو جاپان میں قیام کے دوران اُن کے ساتھ ساتھ رہی۔

سوال: درج ذیل محاورات کے معنی لکھ کر ان کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

نمبر شمار	محاورات	معنی	جملے
۱	گُن گانا	تعریف کرنا	مجید اپنے دوستوں کے گُن گاتا ہے۔
۲	رسی جل گئی پر بل نہیں گیا	اپنی عادت پر اڑے رہنا	حمید نقصان اُٹھانے کے باوجود بھی باز نہیں آتا ہے۔لگتا ہے رسی جل گئی پر بل نہیں گیا۔
۳	ٹانگ اڑانا	رکاوٹ بننا	وسیم خواہ مخواہ ہمارے کام ٹانگ اڑاتا ہے۔
۴	آنکھیں بچھانا	انتظار کرنا	سلیم کی ماں آج بھی اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کے لئے آنکھیں بچھائے رہتی ہے۔

جانچ

درجِ ذیل اقتباس کو غور سے پڑھنے کے بعد اس کے آخر پر دئے گئے سوالات کے جوابات لکھئے۔

''مجتبیٰ حسین کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا، جن میں 2007ء میں پدم شری ایوارڈ بھی شامل ہے۔مجتبیٰ حسین بہت سی ادبی انجمنوں کے جنرل سیکریٹری رہے ہیں۔مجتبیٰ حسین کی ادبی اور تخلیقی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہی ہوا۔وہ اپنے کالج کی طلبہ یونین کے بزم اُردو کے جنرل سیکریٹری رہے، وہ اچھے گلوکار اور اداکار بھی تھے۔عثمانیہ یونیورسٹی کی بزم ادب کے بھی جنرل سیکریٹری بنے۔روزنامہ سیاست، میں پہلے صحافی پھر شاہد صدیقی

کے انتقال کے بعد کالم نویس بن گئے۔ اس طرح اُن کی مزاح نگاری کی بھی ابتدا ہوئی۔ انہوں نے اپنی ادبی سرگرمی کی وجہ سے جاپان، برطانیہ، فرانس، کینڈا، امریکہ، روس اور سعودی عربیہ کا سفر کیا۔ سبکدوشی کے بعد ''سیاست''، ماہنامہ ''شگوفہ'' اور ماہنامہ ''کتاب نما'' میں اُن کے مضامین پابندی سے چھپتے ہیں۔ اُن کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں: تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، جاپان چلو، جاپان چلو، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، ہوئے ہم دوست جس کے، آپ کی تعریف وغیرہ وغیرہ۔''

سوالات

۱۔ مجتبیٰ حسین کو پدم شری کب ملا؟

۲۔ اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد مجتبیٰ حسین کے بارے میں آپ کا پہلا تاثر کیا ہوگا؟

۳۔ مجتبیٰ نے کن ممالک کا سفر کیا؟

۴۔ مجتبیٰ حسین کی چند تصانیف کے نام لکھیے:

۵۔ ''صحافت'' میں مجتبیٰ کالم نویس کب بن گئے؟

درجِ سوالات کے مختصر جوابات لکھیے:

۱۔ مزاح نگاری کے بارے میں چند جملے لکھیے:

۲۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے بارے ایک اقتباس لکھیے:

۳۔ ''یونسکو کی چھتری'' آپ کو کیسا لگا؟ مختصر لکھیے:

۴۔ چھتری کے بارے میں دس جملے لکھیے:

کتابیات

۱۔	مجتبیٰ بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار	ارشاد آفاقی
۲۔	جاپان چلو جاپان چلو	مجتبیٰ حسین
۳۔	مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ	مرتب: سید امتیاز الدین
۴۔	اردو ادب میں سفرنامے	انور سدید
۵۔	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار

مرزا غالب

سوانح نگاری

تعارف:

سوانح نگاری کو اُردو میں ایک علیحدہ صنف کا درجہ حاصل ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں مولانا حالؔی اور مولانا شبلؔی نے جب اُردو میں سوانح نگاری کا آغاز کیا تو انہوں نے فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں سوانح نگاری کے جو اصول رہے ہیں ان سے فائدہ اُٹھایا۔ سوانح میں عام طور پر زندگی کے کسی

خاص شعبے سے تعلق رکھنے والی کسی مشہور اور ممتاز ہستی کے حالاتِ زندگی اور اس کے کارناموں کی روداد بیان کی جاتی ہے۔اس میں ضروری ہے کہ پہلے سوانح نگار تحقیق کر کے تمام ضروری مواد جمع کرے اور پھر اسے اس طرح ترتیب دے کر پیدائش سے موت تک زندگی کے تمام اہم واقعات اور کارنامے ایک واقعہ کی صورت میں سامنے آجائیں۔حالؔی کی ''حیاتِ جاوید''،''یادگارِ غالبؔ''،شبلی کی ''الفاروق''،قاضی عبدالغفار کی ''آثار ابوالکلام'' اور غلام رسول مہؔر کی ''غالبؔ'' اُردو میں سوانح نگاری کے قابلِ قدر ادبی نمونے ہیں۔

مقاصد:

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل مقاصد کی تکمیل ہوگی ؛

۱۔ طالبِ علم سوانح نگاری کے فن سے واقف ہوں گے۔

۲۔ طالبِ علم مرزا غالب کی نثر نگاری کی خوبیوں کو سمجھ سکیں گے۔

۳۔ طلاب جدید نثر کے تقاضوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

آموزشی ماحصل

۱۔ طلاب سوانح حیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۲۔ طلاب سوانح نگاری کے فن پر بحث کرتے ہیں۔

۳۔ طالبِ علم جدید نثر کی تاریخ اور اصولوں پر مضامین لکھتے ہیں۔

۴۔ طالبِ علم غالب کے خطوط کے اسلوب اور جمالیات پر بات بھی کرتے ہیں اور مضامین بھی لکھتے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ

حالاتِ زندگی:

مولانا الطاف حسین حالیؔ 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ابھی صرف نو سال کے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے گھر میں ہی حاصل کی اور مزید تعلیم کیلئے دہلی چلے گئے۔دہلی میں قیام کے دوران با قاعدہ مرزا غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ان کی شاگردی حاصل کی۔یہیں شاعری کی بھی شروعات کی۔غالبؔ سے انہوں نے کافی فیض حاصل کیا اور ان کی وفات کے بعد دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی صحبت سے بھی حالیؔ کو کافی فائدہ ملا۔کچھ وقت گزرنے کے بعد حالیؔ لاہور گئے اور پنجاب گورنمنٹ کے بکڈپو میں کام کرتے رہے۔اس دوران انہوں نے ادب کا کافی گہرا مطالعہ کیا اور محمد حسین آزادؔ کے ساتھ مل کر نئے انداز کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی اور ان کے لیے کئی عمدہ نظمیں بھی لکھیں۔ صحت کی خرابیوں کی وجہ سے چار سال کے بعد دہلی لوٹ گئے جہاں سر سید احمد خان کے خیالات نے ان کی سوچ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔حالیؔ کا انتقال 1914ء میں ہوا۔

ادبی کارنامے:

حالیؔ اُردو شعروادب کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں نثر اور نظم دونوں کو انہوں نے ایک نئی سنجیدگی عطا کر دی۔ایک طرف انہوں نے ''حیاتِ جاوید''،''حیاتِ سعدی'' اور ''یادگارِ غالبؔ'' لکھ کر اس میدان میں ایک نئے انداز کی بنیاد ڈالی تو دوسری طرف ''مقدمہ شعروشاعری'' تحریر کر کے

شاعری کو سادگی، سنجیدگی اور تاثیر بخشی اور اس کو ملک وقوم کیلئے فایدہ مند بنانے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ اُردو میں جدید شاعری کی بنیاد ڈالنے کا سہرا بھی حالؔی کے ہی سر ہے۔ حالؔی کی تصنیفات کی فہرست حسبِ ذیل ہے:۔

حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، مقدمہ شعروشاعری، مقالاتِ حالؔی، مسدس حالؔی، مرثیۂ غالبؔ، شکوۂ ہند، دیوانِ حالؔی، مجموعۂ نظم حالؔی، مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد، مجموعۂ نظم فارسی، علمِ طبقات الارض، مجلس النساء، گریاں مسموم۔

حالؔی کا طرزِ تحریر/ اسلوب/ نثر نگاری:

حالؔی کی نثر ہو یا نظم، سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ توانا اور پُر تاثیر ہے۔ سرسید کے بعد اگر اردو شعر وادب پر کسی کا بہت بڑا احسان ہے تو وہ مولانا حالؔی ہے۔ حالؔی کی تحریر کی خاص خوبی ان کی سادگی ہے۔ سوانح عمریوں میں بھی انہوں نے یہی طرز اپنایا ہے۔ ان کی سادگی میں بھی تازگی، شگفتگی اور دلفریبی پائی جاتی ہے۔ حالؔی عملی تنقید کے علمبردار ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی خیال کا اظہار اصول اور نظریات کے دائرے میں رہ کر کرتے ہیں۔

خطوطِ غالب یا غالب کی مکتوب نگاری

تمہید:

ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف طریقوں سے رابطے میں رہتا ہے۔ قدیم زمانے میں نقل وحمل کے وسائل کم تھے لہٰذا رابطے کی صورتیں بھی کم تھیں۔ آج کل وسائل بہت ہیں۔ سائنس کی ایجادات نے رابطوں کو بہت آسان کر دیا۔ ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود آدمی آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں دنیا ''عالمی گاؤں'' کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

لیکن جب یہ سہولتیں میّسر نہیں تھیں تب کسی کے بارے میں جاننے کا ذریعہ خطوط ہوا کرتے تھے۔ ذیل میں خطوط نگاری کے بارے میں ضروری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔

تعارف:

خط لکھنے کا چلن قدیم زمانے سے ہی حاوی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے اہلِ روم نے خطوط لکھے۔ خط لکھنا ہر ملک، مذہب اور تہذیب میں قابلِ تعریف رہا ہے۔ خطوط میں جہاں نجی باتیں بیان کی جاتی ہیں وہیں ہر عالمانہ، فلسفیانہ، منطقیانہ، صوفیانہ مسائل بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں خطوط نگاری کے بہترین اور عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔

انگریزی میں ولیم کاوپر کے خطوط ادب کا شہکار مانے جاتے ہیں۔ اس کے مکتوبات کی خوبی یہ ہے کہ وہ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بیان کریں تو ان کے قلم سے گیت بن کر ٹپکتی ہیں۔ عربی فارسی میں قرونِ وسطیٰ میں خطوط نگاری نے کافی ترقی کی۔ چونکہ مسلمانوں کے دورِ عروج میں عربی اور فارسی ہی علمی اور ادبی زبانیں تھیں لہٰذا ان دو زبانوں میں خطوط نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کئے گئے۔ برصغیر میں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مرزا مظہر جان جاں کے خطوط فارسی ادب کا شہکار ہیں۔

اُردو میں مکتوب نگاری کا دور غالب سے شروع ہوا۔ غالب سے پہلے فارسی زبان میں خطوط نگاری کا چلن جاری تھا۔ اُس زمانے میں اگر کسی نے اُردو میں خط لکھے بھی تو بھی زبان کے دقیق پن کی وجہ سے وہ عوام کی دسترس سے باہر ہی ہوتے تھے۔ غالبؔ کے بعد اُردو میں خطوط نگاری کے بہترین نمونے سامنے آئے۔ حالؔی، شبلؔی، مہدی افادی، اقبال، ابوالاموددودی، ابوالحسن ندوی وغیرہ نے خطوط نگاری کے فن کو کافی وسعت وترقی دی۔

مکتوب نگاری کے بارے میں بعض دانشور ادیبوں نے لکھا ہے کہ اسے نجی ہونا چاہیے۔نجی باتوں میں رنگارنگی، دلچسپی، متنوع اور عمومیت پیدا کرنا اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامہ ہوتے ہیں۔ خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بُنے جاتے ہیں۔ زندگی میں لمحے قیمتی ہوتے ہیں۔ان لمحوں کو زندگی کے دامن سے چُرا لینا، محفوظ رکھنا اور رازداروں میں تقسیم کرنا ہی حُسنِ عمل ہے۔

خط میں استدلال کا زور بھی ہوسکتا ہے۔فلسفہ پر باقاعدہ بحثیں بھی ہوسکتی ہیں۔ بالارادہ فن کاری سے بھی خط خالی نہیں ہوتے۔لیکن اس صورت میں یہ خط عوام کو کوئی حظ نہیں بخش سکتے۔ یہ خواص کے دائرے میں مقید ہوجاتے ہیں۔انسانی زندگی کے وہ سبک، دلکش اور نازک پہلو جو بلند ادبی کارناموں میں ظاہر نہیں ہوتے، خطوں میں نمایاں ہوجاتے ہیں۔مکتوب نگاری چونکہ ادب کی سب سے آسان صنف ہے اس لئے خوب پروان چڑھی۔ رومانوی دور میں بھی بعض کامیاب مکتوب نگار پیدا ہوئے۔

آپ نے کیا سیکھا:

۱۔ انسان خطوط کے ذریعے دوسرے انسانوں سے رابطہ قائم کرتا ہے۔

۲۔ خطوط لکھنے کا چلن قدیم زمانے سے ہی رائج رہا۔

۳۔ خطوط زیادہ تر ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ان کو نجی خطوط کہتے ہیں۔

۴۔ ہر زبان میں خط لکھنے کا رواج رہا ہے۔

۵۔ خطوط میں عام مسائل سے لے کر بڑے بڑے علمی مسائل تک بیان کئے جاتے ہیں۔

خطوطِ غالبؔ کی اہمیت

مرزا غالب کو قدرت نے شعر و ادب ہی کیلئے پیدا کیا تھا۔ اُردو نثر پر توجہ کرنے سے پہلے وہ ایک مدت تک فارسی میں خط لکھتے تھے، لیکن جب 1850ء کے بعد انہوں نے اُردو میں خط لکھنے کا آغاز کیا تو اس میں بھی ایک نئی شاہراہ ڈھونڈ نکالی۔ایک ایسا طرزِ تحریر اور اسلوب نگارش ایجاد کیا جو اُن سے پہلے نایاب تھا اور ان کے بعد بھی اس کا معیار قائم نہ رہ پایا اور نہ ہی کسی سے یہ اسلوب نبھ سکا۔اُردو نثر میں غالب کی شہرت اُردو خطوط نگاری کی وجہ سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے خطوط میں علمی و ادبی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔اُن کے خطوط کے مجموعے ''اُردوئے معلیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے خطوط کا مجموعہ کئی جلدوں میں نئی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ان کے خطوط بے حد دلکش، طرزِ تحریر سادہ و سلیس اور بامحاورہ ہے۔کہنا چاہیے کہ سادہ خطوط نگاری کی ایجاد کا سہرا غالب کے سر ہے۔

مرزا کے اندازِ نگارش کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بے تکلف لکھتے ہیں۔ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت شاید ہی کہیں یہ احساس ہوتا ہو کہ الفاظ کے انتخاب میں یا مطالب کی تلاش و جستجو میں انہیں کاوشیں کرنا پڑی ہوں۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔ان کے خطوط پڑھ کر قاری کو لگتا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔اس سلسلے میں غالب نے ایک خط میں، جو مرزا حاتم علی مہر کو لکھا تھا، اپنے اندازِ تحریر کے بارے میں لکھا،

''مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے۔

ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو''

جدّت مرزا کے پورے کلام نثر و نظم کی جان ہے۔ وہ کوئی بات عام اور فرسودہ انداز میں نہیں کہتے۔ ہر مکتوب میں مکتوب الیہ کو نئے خطاب سے پکارتے ہیں۔ خط کے آخر میں اپنا نام بھی اکثر عجیب و غریب انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔خواجہ غلام غوث بےخبر کو لکھتے ہیں:

’’قبلہ! آپ کو بھی یہ خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے۔‘‘

غالب کے خطوط میں عامیانہ پن نہیں ہے۔ سب مراتب کا خیال موجود ہے۔ غصہ کے اظہار میں بھی ظرافت کا رنگ چھلکتا ہے۔ اُن کے خطوط میں مرقع نگاری، جزئیات نگاری اور ڈرامائیت کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ غالب نے جابجا اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان سے مرزا کی پوری سوانح حیات تیار کی جاسکتی ہے۔ اثنائے تحریر میں ماحول کی جزئیات اس بے ساختگی سے بیان کرتے ہیں کہ حیاتِ غالب کا مکمل نقشہ تیار ہوسکتا ہے۔ وہ کہاں پیدا ہوئے؟ خاندان کی کیفیت کیا تھی؟ وسائلِ معاش کیا تھے؟ کن کن لوگوں سے ملاقات تھی؟ قلعہ کب جاتے تھے۔ غدر کے احوال ،دوستوں کے ساتھ ملاقات، اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات خطوط میں بکثرت ملتے ہیں۔

غالب کے خطوط اپنے دور کی تاریخی، سماجی، سیاسی اور مذہبی حالات کے حوالے سے مستند دستاویز ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اپنے زمانے کی معاشرت اور سیاست کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ خصوصاً جنگ 1857ء کے معتبر مرقعے خطوط غالب میں مل جاتے ہیں۔

مرزا کی تحریر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ بھی بیان کرتے ہیں اس کی تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ شاید وہ اصلیت رنگ و روغن والی تصویریں موجود نہ ہو۔ نکتہ آفرینی ان کے خطوط کی ایسی خصوصیت ہے جس نے ان کے خطوط کو زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ ہر بات میں لطیف اور دلچسپ نکتے پیدا کر لیتے ہیں۔

غالب کے خطوط میں طنز و مزاح کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اُن کا ذہن زندگی کی تلخیوں سے باخبر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کی تلخیاں آدمی کے رویہّ کو منفی رنگ دیتی ہیں۔ انہوں نے اس منفی ذہنیت کو اپنی حسِ ظرافت اور طنز و مزاح سے مغلوب کر دیا۔ وہ کبھی زمانے پر ہنستے ہیں، کبھی آلامِ روزگار پر اور کبھی خود پر۔ کبھی اپنے وقت کے رسوم و رواج پر۔ طنز و مزاح کا عنصر اُن کے تعزیت ناموں سے بھی نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے اس طریقے سے اُنہوں نے زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کیا۔ شوخی اور ظرافت ان کے خطوط میں جابجا موجود ہے۔ وہ مقفّی عبارتیں بھی لاتے ہیں لیکن اُن میں آمد ہوتی ہے آورد نہیں۔ ان میں روانی ہوتی ہے تکلّف نہیں۔ وہ لکھتے جاتے ہیں اور قافیے بنتے جاتے ہیں۔ میر مجروحؔ کو لکھتے ہیں:

’’سید صاحب! نہ تم مجرم نہ میں گناہگار، تم مجبور میں لاچار، لو اب میری کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔‘‘

مرزا فضول اور بھرتی کے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ استعمال نہیں کئے جاسکتے۔ اگر ایسا کیا گیا تو عبارت کا سارا حسن جاتا رہتا ہے۔

مرزا غالب کی خطوط نگاری نے بے تکلف طرزِ نگارش کا ایک ایسا ادبی معیار قائم کیا جو نثر کی آئندہ کمال آفرینی کی تمہید بن گیا۔ اُن کے خطوط اُن کے ذہنی عمل کی جولانی، دلی کیفیات، حالات و مشاہدات اور مفکرانہ بلندیوں کا آئینہ ہے۔

نہ القاب و آداب کا بوجھل پن، نہ تصنع اور تکلف کی رنگ آمیزی اور نہ زورِ انشا دکھانے کا خبط۔ مرزا خط لکھتے جاتے ہیں، آپ بیتی سنائے جاتے، تنقیدی نکتے وارد ہوتے ہیں۔ دوستوں سے گلے شکوے ہوتے ہیں، اپنے آپ پر ہنستے ہیں اور دوسروں کے غم پر روتے ہیں۔

غالب کے خطوط سے اُردو نثر کی نئی بنیاد اُستوار ہوئی جس بنیاد پر بعد میں سرسید اور ان کے رفقاء نے اُردو زبان کو بلندیوں تک پہنچا دیا۔

مرزا کے خطوط اُردو ادب کا اعجاز ہیں۔ اُن کی ظرافت کی پاکیزگی اور نکھری ہوئی تحریر نے انہیں منفرد ادبی شان عطا کی ہے۔

نصابی سوالات

سوال: ’’اگر مرزا اسداللہ خان غالبؔ کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے‘‘ کیا آپ مولانا حالؔی کی اس رائے سے متفق ہیں یا نہیں؟

جواب: خوش مزاجی مرزا غالبؔ کی شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ اُن کی باتیں بڑی مزے دار ہوتی تھیں۔ نجی زندگی ہو، شاعری ہو یا مکتوب نگاری اُن کی

کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے قلم یا زبان سے جو کچھ نکلے وہ لوگوں کو خوشی فراہم کر سکے۔ اُن کے مزاج میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حالؔی نے اُن کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا ہے، جو بالکل درست ہے اور جس سے ہم متفق ہیں۔

سوال: غالبؔ کے اخلاق کیسے تھے؟

جواب: غالبؔ جتنے اچھے شاعر اور ادیب تھے اتنے ہی بڑے اور اچھے انسان بھی تھے۔ ہر شخص جو اُن سے ملتا بار بار ملنے کے اشتیاق میں رہتا۔ غالبؔ کی ہمدردی، شگفتہ مزاجی اور جادو بیانی کی وجہ سے ہندوستان بھر میں اُن کے دوست اور آشنا ہر مذہب اور ملت میں پائے جاتے تھے۔ غالبؔ کی محفل میں افسردہ مزاج لوگ راحت محسوس کرتے تھے اور اپنا رنج و غم بھول جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی حاجت مند ان کے دروازے سے خالی ہاتھ لوٹا ہو۔ غالبؔ کے سینے میں ایک دردمند دل تھا۔ خود انہوں نے زندگی بھر غم اُٹھائے مگر کسی اور کا دکھ ان سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

سوال: غالبؔ اپنے دوستوں سے کیسے پیش آتے تھے؟

جواب: مرزا غالبؔ جتنے اچھے شاعر اور ادیب تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے۔ ہر شخص جو اُن سے ملتا بار بار ملنے کے اشتیاق میں رہتا۔ غالبؔ کی ہمدردی، شگفتہ مزاجی اور جادو بیانی کی وجہ سے ہندوستان بھر میں اُن کے دوست اور آشنا ہر مذہب اور ملت میں پائے جاتے تھے۔ غالبؔ اپنے دوستوں کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ غالبؔ کی محفل میں افسردہ مزاج لوگ راحت محسوس کرتے تھے اور اپنا رنج و غم بھول جاتے تھے۔ وہ دوستوں کو دیکھ کر بہت خوش ہو جاتے، اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم میں غمگین ہوتے تھے۔

سوال: ''یادگارِ غالبؔ'' پر ایک نوٹ لکھئے۔

جواب: ''یادگارِ غالب'' مرزا غالبؔ کی ایک اہم کتاب ہے۔ 1897ء میں لکھی گئی یہ کتاب کئی وجوہات کی بناء پر ایک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ غالبؔ کی شخصیت اور شاعری پر لکھی گئی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں غالبؔ کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی خوبیوں اور خصوصیات، اشعار کے مطالب، طرزِ بیان کی خوبیوں اور زبان کی نزاکتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ غالبؔ کی شاعری کا ہلکا سا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ غالبؔ شناسی کا پورا ثبوت اس کتاب میں ملتا ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ اُنہوں نے غالبؔ کی کمزوریوں کے بارے میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ اس کے باوجود ''یادگارِ غالبؔ'' غالبؔ شناسی کے میدان میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔

سوال: غالبؔ کے اخلاق و عادات پر نوٹ لکھئے۔

جواب: مرزا اسداللہ خان غالبؔ اُردو ادب کا سب سے قابلِ احترام نام ہے۔ نثر اور نظم میں انہوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ غالبؔ جتنے اچھے شاعر اور ادیب تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے۔ ہر شخص جو اُن سے ملتا بار بار ملنے کے اشتیاق میں رہتا۔ غالبؔ کی ہمدردی، شگفتہ مزاجی اور جادو بیانی کی وجہ سے ہندوستان بھر میں اُن کے دوست اور آشنا ہر مذہب اور ملت میں پائے جاتے تھے۔ غالبؔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ غالبؔ کی محفل میں افسردہ مزاج لوگ راحت محسوس کرتے تھے اور اپنا رنج و غم بھول جاتے تھے۔ وہ سب سے خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے ملتے تھے۔ شاید ہی کوئی حاجت مند ان کے دروازے سے خالی ہاتھ لوٹا ہو۔ جہاں تک ان کے اختیار میں ہوتا وہ مجبوروں اور لاچاروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ اس پر ان کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ مدد اس انداز سے کرتے کہ مجبور شخص کو پتہ بھی نہ چلتا کہ اس پر احسان کیا گیا ہے۔ غالبؔ کے سینے میں ایک دردمند دل تھا۔ خود انہوں نے زندگی بھر غم اُٹھائے مگر کسی اور کا دکھ ان سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ غالبؔ انسان دوست ہمدرد، ملنسار اور شگفتہ مزاج شخص تھے اور اپنے اخلاق اور عادات سے سب کو متاثر کر کے اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔

اچھے اخلاق

اچھے اخلاق انسان کے لئے ایسے زیور ہیں جو انسان کو اپنوں اور پرائیوں میں ایک بلند مقام دلا سکتے ہیں۔ اچھے اخلاق والے کو ہر ایک عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اچھے اخلاق پر ہی دنیا قائم ہے اگر دنیا میں خوش اخلاقی ختم ہو جائے تو دنیا میں رہنے والے سب درندے بن جائیں گے۔ جس میں اچھے اخلاق موجود نہیں اس کی انسانیت کی بنیادیں کھوکھلی اور ناپائیدار ہیں وہ کسی بھی وقت گر کر بری عادتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

خندہ پیشانی اور اچھے برتاؤ سے دوسروں کے ساتھ پیش آنا اچھے اخلاق ہیں۔ خوش اخلاق ہمیشہ اپنی خوش اخلاقی سے دوسروں کے دل جیت لیتا ہے اور بد اخلاق ہمیشہ لوگوں میں ذلیل وخوار ہو جاتا ہے اور دوسروں کی نظروں میں گر جاتا ہے اور لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں نہ وہ اپنوں کے لائق رہتا ہے اور نہ دوسروں کے قابل۔ جس طرح ایک خوبصورت اور مہکدار پھول کو لوگ پسند کرتے ہیں اسی طرح ایک خوش اخلاق انسان بھی ہر دلعزیز ہوتا ہے۔ خوش اخلاق آدمی وہی بن سکتا ہے جو غرور، تکبر اور خود پرستی سے دور ہو۔

خوش اخلاق بننے کے لئے بہت زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر انسان کے اندر دوسروں کے احترام کا جذبہ موجود ہو اور اس کے دل میں دوسروں کے لئے ذراسی ہمدردی پائی جاتی ہو تو وہ با اخلاق بن سکتا ہے۔ اچھے اخلاق کے بغیر انسان کی زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔

جانچ:

درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھئے؛

۱۔ مرزا کے کھانے میں کیا کیا ہوتا تھا؟

۲۔ دوستوں کے ساتھ مرزا کس طرح پیش آتے تھے؟

۳۔ حالی کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟

۴۔ مرزا نے کس سَن سے اُردو میں خطوط نگاری شروع کی؟

۵۔ مرزا نے مراسلے کو کیا بنا دیا؟

۶۔ اُن کے خطوط میں کس جنگ کے مرقعے نظر آتے ہیں؟

۷۔ مرزا کے خطوط میں کیا چیز کوٹ کوٹ کر بھری ہے؟

۸۔ کسی ایک مکتوب الیہ کا نام لکھئے جس کو مرزا نے خط لکھا ہو۔

کتابیات

۱۔	یادگارِ غالب	مولانا الطاف حسین حالؔی
۲۔	غالب شخص اور شاعر	مجنوں گھورکھپوری
۳۔	اردو ادب کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر انور سدید
۴۔	غالب کی مکتوب نگاری	آزاد دائرۃ المعارف (انٹرنیٹ)
۵۔	شعورِ فن	فخر الاسلام اعظمی

شاعری تعریف و تفہیم

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

عام طور پر اہلِ تحقیق کا خیال ہے کہ ابتداء سے ہی شاعری انسانی زندگی کے لیے ادبی اظہار کا نہایت معتبر اور پسندیدہ ذریعہ رہی ہے۔ اس میں جذبات واحساسات کو سمونے اور گردوپیش میں بکھری ہوئی کائنات اور اس کے مظاہر کو بیان کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔خیالات و جذبات،اقدار وروایات، مدح وذم، حالات واقعات وغیرہ کو غیر معمولی انداز میں موزوں کر کے پیش کرنا شاعری ہے۔

علامہ شبلی کہتے ہیں ''جو جذبات یا احساسات الفاظ کے ذریعے سے ادا ہوں ہو شعر ہیں۔''

لرج کی رائے ہیں کہ ''بہترین الفاظ بہترین ترتیب کے ساتھ پیش کردیے جائیں تو یہی شعر ہے۔''

شیکسپیر نے کہا ہے کہ شاعر اپنے تخیل کی مدد سے پرچھائیوں کو جسم اور محسوسات کو زبان دیتا ہے۔

افلاطون شاعری کو الہام اور ارسطو اسے شعوری کوشش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

مولانا حالی کے نزدیک شاعری تین چیزوں کا نام ہے وہ ہیں: تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحّصِ الفاظ۔ حالی کہتے ہیں کہ سادگی، جوش اور اصلیت وہ تین خوبیاں ہیں جو دنیا کے بہترین شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

شاعری حالات و واقعات کی ترجمان ہوتی ہے اور اس معاشرے اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں شاعر رہتا ہے، صرف فنِ شاعری ہی شاعری کا موجد نہیں، بلکہ وہ جذبات جو شاعر کو شعر کہنے پر مجبور کریں، شاعری ہیں۔ اس کی تعریف ایسے بھی مناسب ہے، شاعری ان منظّم جذبات کا نام جو فی البدیہ نازل ہوتے ہیں۔ ان جذبات کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ یا پھر جو ہو جائے وہ شاعری، جو کرنی پڑے وہ تک بندی۔ مصور رنگوں سے تصویر بناتا ہے اور شاعر لفظوں سے۔

شاعری انسان کے جمالی احساسات کو پرورش کرنے اور زندہ رکھنے میں ایک مؤثر ذریعہ ضرور ہے جو اسے فطرت کے قریب پہنچا کر سکون دیتی ہے۔ شاعری کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے، وہ جذبات کو انگیختہ کرتی ہے۔

شعر اس منظوم کلام کو کہتے ہیں جس میں وزن و بحر (Metre) اور قافیہ (Rhyme) پایا جاتا ہو اور اس میں نادر افکار، عمدہ خیالات، پراثر مناظر اور اچھوتے جذبات واحساسات کی بہترین ترجمانی اور عکاسی کی گئی ہو۔ لغت کی رو سے لفظ شعر علم وآگہی اور ادراک و شعور سے عبارت ہے اور غنائیت و موسیقیت بھی اس کی ماہیت کا ضروری حصہ ہے۔ شعر میں جو کہا جاتا ہے اسے مذکور اور جو چھوڑا جاتا ہے اسے محذوف کہتے ہیں۔ شعر میں اشارے کنایے سے کام لیا جاتا ہے۔ شعر میں کوئی تجربہ یا قلبی واردات پیش کی جاتی ہے۔

شاعری (Poetry) کا مادہ ''شعر'' ہے اس کے معانی کسی چیز کے جاننے پہچاننے اور واقفیت کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً شعر اس کلام موزوں کو کہتے ہیں جو قصداً کہا جائے۔ یہ کلام موزوں جذبات اور احساسات کے تابع ہوتا ہے۔ اور کسی واقعے کی طرف جاننے کا اشارہ کرتا ہے۔ موزوں الفاظ میں حقائق کی تصویر کشی کو شاعری کہتے ہیں۔ شاعری کسی بھی انسان کے لیے اپنے احساسات وجذبات اور مشاہدات و تجربات کی عکاسی کا نام ہے۔

شعر کا لفظ تاریخی طور پر شعور سے نکلا ہے یعنی کسی چیز کو جاننا اور جدید اصطلاح میں ایسا کلام جو کسی واقعے یا موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہو اور اس

کے کہنے کا کوئی مقصد بھی ہو۔شاعری کا جو ہر لکھنے والے کا تخیل ہوتا ہے۔خیالات کی وسعت اور کسی واقعے یا چیز کے متعلق اس کی سوچ کا پھیلاؤ۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے شاعری ایسے واقعات بھی جو اس نے دیکھے نہیں ہوتے بلکہ صرف پڑھے یا سنے ہوتے ہیں ان کو اس طرح بیان کر جاتا ہے جیسے اس کے سامنے وقوع پذیر ہو رہے ہوں، یہ تخیل ہی اسے زمانے کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔عام آدمی کیلئے صبح کا وقت صرف طلوع آفتاب ہے لیکن شاعر کے لئے یہ وقت بہت سی گرہوں کی گتھی سلجھاتا نظر آتا ہے۔جیسا کہ جوش نے کہا۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو قبول حق کیلئے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

تخیل کے ساتھ ساتھ دوسری شرط مطالعہ کائنات ہے یعنی اپنے اردگرد اور آفاقی سچائیوں کو باریکی سے جاننا۔ یہ صلاحیت تخیل کی طرح خداداد بھی ہوتی ہے۔تاریخ کا مطالعہ، کتابوں سے دوستی اور اہلِ دانش کی صحبت بھی اس سلسلے میں راہنمائی کرتی ہے۔جنرل نالیج جہاں سے بھی حاصل ہوا سے حاصل کرنا کامیاب ادیب کیلئے ضروری ہے اور ہر چیز کے مثبت کو جاننے کیلئے اس کے منفی پہلو کا بھی پتہ ہونا ضروری ہے۔

تخیل کے بعد الفاظ کا چناؤ اور اظہار کا طریقہ معلوم ہونا چاہیے۔یعنی کہ اپنے خیالات کو دوسرے کے سامنے کیسے اور کس انداز میں پیش کرنا ہے۔ شاعر اگر اپنے مشاہدے یا تخیل کو مناسب الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا تو ایسے شعر سے شعر نہ کہنا بہتر ہے۔

آمد اور آورد:

آمد کا شعر عموماً ایسے شعر کو کہتے جو شاعر کے ذہن بے ساختہ آئے اور اسی طرح لکھا جائے۔آورد سے مراد وہ شعر جو بہت غور وفکر سے مرتب ہو۔

دنیا بھر میں 21 مارچ کو شاعری کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔یونیسکو کے زیر اہتمام یہ دن منانے کا مقصد شاعروں اور شاعری کی پذیرائی کرنا اور اس کی ترویج کرنا ہے۔یونیسکو نے فنون اور ثقافتوں میں شاعری کے اہم کردار کو تسلیم کرتے ہوئے 1999ء میں شاعری کا عالمی دن منانے کا فیصلہ کیا تھا۔

غزل

تمہید

غزل کے خدوخال سے عام طور پر لوگ مانوس نظر آتے ہیں۔آپ بارھویں جماعت کے ہونہار طالبِ علم بھی اس صنف شعر سے ضرور آشنا ہونگے۔ویسے تو آپ نے اردو کے مشہور شاعروں جیسے ولی دکنی، میر درد، میر تقی میر، آتش، غالب، مومن، حسرت اور اقبال کی کچھ غزلوں کو پڑھا اور سنا ہوگا۔ہمیں یقین ہے کہ غزلیہ اشعار کا کچھ حصہ آپ کے حافظے میں ضرور موجود ہوگا۔آپ شاید یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے غزل کی ترویج واشاعت میں ایک اہم رول ادا کیا ہے چنانچہ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں غزل زیادہ مقبول صنف ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ مقبول ترین صنف ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

غزل نہ صرف اردو بلکہ پوری ہندوستانی شاعری کی آبرو ہے۔آج برصغیر کی متعدد زبانوں میں غزل کہی جا رہی ہے۔زماں ومکاں کی سرحدیں غزل کی مقبولیت میں کبھی مانع نہیں ہوئیں۔آج غزل شمع خانہ مشرق نہ رہ کر چراغِ محفلِ مغرب بھی بن گئی۔آج لندن اور امریکہ میں نہ صرف ہندوستانی نژاد شعراء غزلیں کہہ رہے ہیں بلکہ خواجہ احمد فاروقی کے بقول گوئٹے اور ٹینیسن بھی غزل کی داد دے چکے ہیں۔

اس اکائی میں غزل کے مفہوم وہیئت کی وضاحت کی جائے گی۔غزل کے فن اور اس کی صنفی اہمیت کو بیان کیا جائے گا۔نیز اس صنف میں استعمال ہونے والی

صنعتوں اوراس کے موضوعات کے بارے میں بھی بات ہوگی اور آخر پر غزل کے آغاز وارتقا پر بھی اختصار سے بات ہوگی.

مقاصد

ا۔ طالب علموں کو غزل کی صنفی شناخت،اس کے فن اور موضوعات اور اس کی تاریخ سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طالب علموں کے جمالیاتی حس کو بیدار کر کے ان کے اندر شعری ذوق پیدا کرنا۔

۳۔ طالب علموں میں شعرفہمی پیدا کر کے انھیں معروف اردو شعرا سے متعارف کرانا۔

آموزشی حصولیابیاں(Learning outcomes)

ا۔ طالب علم غزل کی صنف اور ہیئت ،غزل کا فن اور اس کی تاریخ جانتے ہیں۔

۲۔ طالب علم غزلیہ اشعار کو سننا، پڑھنا اور سمجھنا جانتے ہیں۔

۳۔ طالب علم غزلیہ اشعار کی تشریح اپنے الفاظ میں کرتے ہیں۔

۴۔ طالب علم مختلف غزل گو شعرا اور ان کے کلام پر گفتگو کرتے ہیں۔

۵۔ طالب علم غزل خوانی کے فن سے واقفیت رکھتے ہیں۔

بنیادی موضوع

غزل کی صنف

غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے حُسن و جمال کی تعریف کرنا۔گویا غزل کا دائرہ کار حُسن پرستی اور عشق مجاز ہے۔شمس قیس رازی نے غزل کی الگ توجیہ کی ہے۔''ہرن کو عربی میں غزال کہتے ہیں اور غزال کی ایک خاص آواز کو غزل الکلب کہا جاتا ہے۔جب ہرن کو شکاری کتے گھیر لیتے ہیں تو وہ سہم جاتا ہے اور اس کے حلق سے درد بھری آواز نکلتی ہے۔شکاری کتے اس آواز سے متاثر ہو کر اس کا تعاقب چھوڑ دیتے ہیں۔اس آواز میں مایوسی کے ساتھ امید کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔اس تعریف کی رو سے غزل عشقیات سے نکل کر زندگی کی کشمکش،انسان کی کاوشوں اور امید وخوف کی حالت کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے۔

غزل کا ماخذ عربی قصیدہ ہے۔قصیدہ میں عشقیہ تشبیب کو غزل کہا جاتا تھا۔جس میں بالعموم محبوب کا سراپا بیان کیا جاتا اور اس کے حُسن کی تعریف کی جاتی۔ایرانی شعرا نے اس تشبیب کو قصیدے سے الگ کر کے فارسی میں ایک الگ صنف ایجاد کی جو غزل کے نام سے مشہور ہوئی۔پھر یہ صنفِ غزل فارسی سے اردو میں آئی اور یہاں اس نے ترقی کے مختلف مدارج طے کئے۔

غزل کی ہئیت

جن چیزوں سے غزل کی صورت بنتی ہے ان میں پہلی چیز ہے بحر (شعر کا وزن کرنے یا اسے ناپنے کا پیمانہ بحر کہلاتا ہے) غزل کے تمام مصرے کسی ایک بحر میں ہوتے ہیں۔بحر کے بعد غزل کی دوسری پہچان ہے ردیف وقافیہ۔ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا ایسا مجموعہ ہے جسے غزل کے پہلے شعر یعنی مطلع کے دونوں مصروں کے آخر میں اور اس کے بعد ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں دہرایا جائے۔قافیہ وہ لفظ ہے جو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مطلع کے دونوں مصرعوں کے آخر میں اور اس کے بعد ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں دہرایا جائے لیکن ردیف ہو تو اس سے پہلے۔مثال کیلئے آتش کا یہ شعر دیکھے۔

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے　　　ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

اس شعر میں کرتے ، ردیف ہے اور 'روبرو' قافیہ۔ اس غزل میں روبرو کے ساتھ گفتگو، آرزو جستجو وغیرہ قوافی استعمال ہوئے ہیں۔ یہی شعر مطلع کی مثال بھی ہے۔ مطلع غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ استعمال کیا گیا ہو اور اگر غزل مردّف ہے تو ردیف بھی۔ غزل کے آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ آتش کی اسی غزل کا مقطع ہے۔

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش　　　　برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مطلع کے فوراً بعد آنے والے ہم قافیہ یا ہمقافیہ یا ہم ردیف شعر کو حسن مطلع یا زیبِ مطلع کہتے ہیں غزل کے سب سے عمدہ بیت کو شاہ بیت کہتے ہیں۔

جس غزل میں ردیف نہ ہو اور صرف قافیے ہوں اس کو غیر مردف کہتے ہیں وہ بحر اور ردیف اور قافیہ جس کے لحاظ سے غزل کہی جاتی ہے اسے غزل کی زمین کہتے ہیں۔

غزل کا فن رمز و ایما کا فن ہے یعنی شاعر اشارے کنایے میں باتیں کرتا ہے اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ عام طور پر غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے شاعر کو اپنا تجربہ اپنی واردات ایک شعر میں سمودینی پڑتی ہے اسلئیکیسا ہی پیچیدہ تجربہ کیوں نہ ہو اسے پیش کرنے کیلئے شاعر کو بس دو مصرعوں کا ننھا سا پیمانہ میسر ہوتا ہے۔

صنعت نگاری: غزل کے فن میں صنعت نگاری کی خاص اہمیت ہے۔ صنائع کے استعمال سے شعر میں کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان سے شعر میں مختلف خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غزل صنائع بدائع کا استوعمال ہر دور میں رہا ہے۔ بعض صنعتوں سے الفاظ اور آوازوں کی تکرار ہوتی ہیاور شعر کی نغمگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس قبیل کی چند صنعتیں یہ ہیں۔

ا۔ تکرار یا تکریر:۔ کسی لفظ کو مقرر لانا۔ مثلاً میر کا یہ شعر۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۲۔ تجنیس تام۔ شعر میں ایک ذو معنی لفظ کو دو جگہ علاحدہ معنوں میں استعمال کرنا۔ اس صنعف سے جہاں لفظ کی ٹکرار ہوتی ہے جو صوتی دلکشی بڑھاتی ہے وہی ابہام کا حسن پیدا ہوتا ہیں فانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر　　　　جس کی تصویر ہے خیال اپنا

اس شعر میں خیال کا لفظ ایک ہی مفہوم میں دو جگہ آیا ہیں جس سے اصوات کی ٹکرار ہوتی ہے۔ لفظ تصویر بھی دو جگہ آیا ہیں لیکن ہر جگہ اس کے معنی مختلف ہیں پہلے مصرع میہں لفظ تصویر اصلی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرے مصرعے میں تصویر کے معنی ہیں مثال۔ یہ تجنیس تام ہے۔

صنعت اشتقاق:۔ شعر میں ایسے الفاظ لانا جو ایک ہی مصدر سے مشتق ہوں جیسے:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں　　　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب سے

بعض صنعتوں کا تعلق صرف معنی سے ہوتا ہے جو شعر کے معنوی حسن کو بڑھاتی ہیں جیسے صنعت تضاد۔ تجاہل عارفانہ اور حسن تعلیل وغیرہ

ا۔ صنعت ایہام:۔ شعر میں ذو معنی لفظ لایا جایے۔ ذہن قریب کے معنی کی طرف جایے لیکن غور کرنے پر دوسرے اور اصلی معنی کی طرف ذہن منتقل ہو۔ شعر کا مصرع ہے

ہم خاک بھی ہو گیے پر اب تک جی سے نہ تیرا غبار نکلا

صنعت مراعات النظیر:۔ شعر میں ایسے الفاظ لایے جائیں جو آپس میں مناسبت رکھتے ہوں

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھتے تھمے　　　　نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہاں رخش باگ اور رکاب میں مناسبت ہے۔

تجاہل عارفانہ:۔کسی بات کو جانتے ہوئے بھی لاعلمی کا اظہار کرنا۔مثلا

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے　　　　کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

صنعت لف ونشر:۔شعر میں پہلے چند چیزعں کا ذکر کیا جایے پھران کے منسبات کو بیان کیاں جایے جیسے

تیرے رخسار وقد وچشم کے ہیں عشق زار　　　　گل جدا سرو جدا نرگس بیمار جدا

صنعت حسن تعلیل:۔تعلیل کے معنی ہیں علت باوجہ بیان کرنا ۔حسن تعلیل سے مراد ہے کسی چیز یا امر کی حقیقی علت سے توجہ ہٹا کر اس کی کویی اور علت بیان کی جایے۔مثلا یہ شعر

نکلا ہے لالہ خاک کے نیچے سے سرخ سرخ　　　　رنگین ہوا شہیدوں کے خون میں نہا نہا

صنعت مبالغہ:۔کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔مثلا یہ شعر دیکھیے۔

چمکے جو تیغ قہر کسی روز جنگ میں　　　　ٹھہرے نہ سایہ خوف کے مارے بدن کے پاس

صنعت تلمیح:۔کسی مشہور قصے واقعے یا کردار یا شخصیت کے ذریعے کسی بات کی طرف اشارہ کیا جایے۔تلمیح کے استعمال سے ایک یا چند لفظوں کے ذریعے سارا واقعہ یا قصا سامنے آجاتا ہے۔شعر میں کفایت لفظی اور ایمانیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔مثلا

عاشق اس غیرت بلقیس کا ہوں میں آتشؔ　　　　بام تک جس کے کبھی مرغ سلیمان نہ گیا

غرض ضایع لفظی اور ضایع معنوی نہ صرف شعر کی لفظی اور معنوی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ ان سے شعر میں ایمائیت کا وصف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

غزل کی فنی خصوصیات

غزل کا فن رمز وایما کا فن ہے یعنی شاعر اشارے کنایے میں باتیں کرتا ہے اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔عام طور پر غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے شاعر کو اپنا تجربہ اپنی واردات ایک شعر میں سمو دینی پڑتی ہے کیسا ہی پیچیدہ تجربہ کیوں نہ ہو اسے پیش کرنے کیلئے شاعر کو بس دو مصرعوں کا ننھا سا پیمانہ میسر ہوتا ہے۔

غزل کا ہر شعر جُداگانہ مضمون کا ہوتا ہے ایک شعر کا دوسرے شعر یا اشعار سے معنوی ربط ہونا ضروری نہیں۔یہ دوسری بات ہے کہ چند غزلوں میں ایک ہی خیال یا موضوع کا تسلسل نظر آتا ہے ایسی غزلوں کو غزلِ مسلسل کہا جاتا ہے۔شاعر جب غزل کے ہر شعر میں الگ الگ مضمون ادا کرتا ہے تو اس کے لئے مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے۔ایک طریقہ یہ ہے کہ بات کا کچھ حصہ بیان کیا جاتا ہے جسے مذکور کہتے ہیں اور کسی حصے کو حذف کیا جاتا ہے جسے اصطلاح میں محذوف کہتے ہیں۔ان کہی بات کو قاری کے تخیل پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔قاری اپنے تخیل سے کام لے کر خلا کو خود پُر کر لیتا ہے۔مثال کیلئے غالبؔ کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر میں یہ بات محذوف ہے کہ کہنے والا کون ہے اور کس سے کہہ رہا ہے اور واقعے کا پس منظر بھی پیش نہیں کیا جاتا لیکن اس کے باوجود قاری تک معنی کی ترسیل ہو جاتی ہے اور وہ اس شعر میں بیان کی گئی کہانی کو سمجھنے لگتا ہے۔

جب بات وضاحت اور صراحت کے ساتھ نہیں کہی جاتی تو اس میں ایک طرح کی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اسے ابہام کہا جاتا ہے جس سے شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ابہام کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شعر کے ایک سے زیادہ معنی نکل سکتے ہیں ۔غالبؔ کا ایک شعر ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت یعنی صحرا کو دیکھ کے گھر کیوں یاد آیا؟ اسلئے کہ وہاں بھی دشت کی سی ویرانی تھی۔ دوسرا مطلب۔ دشت پیمائی سے یہ سبق ملا کہ نہ عشق کرتے نہ گھر چھوڑ کے یہاں آنا پڑتا۔ تیسرا مطلب ان دونوں سے بالکل الگ ہے۔ دشت کو دیکھ کے خیال آیا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں، اصل ویرانی تو میرے گھر میں تھی۔

غنائیت (Lyricism) غزل کی ایک اہم فنی خصوصیت ہے۔ شعر میں ترنم یا موسیقی نہ ہو تو وہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ غزل میں یہ خوبی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی دوسری صنف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ پوری غزل کسی ایک بحر میں ہوتی ہے یعنی اس کے ہر مصرعے کا وزن یکساں ہوتا ہے جس سے ایک خاص دھن پیدا ہوتی ہے۔

غزل کے موضوعات

غزل کا خاص موضوع عشق ہے۔ غزل کا واحد متکلم عاشق ہوتا ہے۔ غزل میں وہ اپنے عشقیہ جزبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔ حسرت کا شعر ہے۔

حسن بے پروا کو خود بیں وخود آرا کر دیا　　　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

عشق مجاز کے بعد غزل کا خاص موضوع عشق حقیقی اور تصوف ہے۔

ارض وسماں کہاں تیری وسعت کو پا سکے　　　　میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سماں سکے

عشق مجاز اور عشق حقیقی یا تصوف کے علاوہ اردو غزلیہ شاعری کے دیگر موضوعات کا شمار نہیں۔ حیات وکائینات کے گونا گوں مسایل پر غزل گو شاعروں نے غور وخوض کیا، زندگی کو برتا، قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ غرض غزلیہ شاعری نے انسانی زندگی کے سارے معملات کا احاط کیا۔

غزل کا آغاز وارتقا:

غزل کی جڑیں ہماری تہذیبی اور سماجی زندگی میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہ سینکڑوں سال سے اردو شاعری کی روح میں سمائی ہوئی ہے۔ فکر واحساس غزل کے سانچے میں صدیوں سے ڈھلتے آئے ہیں۔ ہر دور میں اس صنف نے ہمارے جزباتی، ذہنی اور سماجی تقاضوں کی بڑی سچی اور بھر پور عکاسی کی ہے۔

ہمارے یہاں غزل کی سینکڑوں سال کی تاریخ ہے۔ اردو میں غزل گوئی کی ابتدا امیر خسرو سے ہوئی لیکن دکنی شاعروں نے اس صنف کو پہلے پروان چڑھایا۔ دکنی شعرا نے غزل کا سانچا فارسی شاعری سے لیا لیکن فارسی کی پیروی بہت کم کی۔ دکن کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ غزل گو بھی تھا لیکن اس صنف میں جن دکنی شعرا نے خاص طور پر نام پیدا کیا ہے ان میں سراج اور ولی قابل ذکر ہیں شمالی ہند کے فارسی شعرا ولؔی کا کلام دیکھ کر ہی اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں شاہ حاتؔم، شاہ مبارک آبرو، مرزا جانِ جاناں کے نام اہم ہیں۔ اس کے بعد غزل کے سنہری دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کے لافانی شاعر ہیں۔ میر، سوؔدا اور دردؔ اس کے بعد دہلی کے اجڑنے پر لکھنو ما شاعری کی محفل جمتی ہے۔ یہاں کے شاعروں میں مصحفؔی، انشا، اور جرتؔ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی غزلوں کا انداز شعرائے دہلی کی غزلوں سے مختلف ہے۔ اس کے بعد دہلی میں شعر وشاعری کی محفلیں پھر سے آراستہ ہوئی ہیں۔ غالب ذوق اور مومن اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالب نے غزل کے موضوعات کو وسعت دی اسے فکر سے آشنا کیا۔ ذوق نے زبان پر زیادہ زور دیا۔ مومن نے معاملات عشق میں نام حاصل کیا۔ اقبال نے غزل میں فلسفہ پیش کر کے ایک نئے انداز کی بنیاد رکھی۔ ان کے بعد اصغر، فانی، شاد، حسرت، آرزو، یگانہ اور جگر نے غزل کو فروغ دیا۔ پھر فراق، فیض، روش، جذبی، خورشید الاسلام، ناصر کاظمی، خلیل الرحمان اعظمی، شاذ تمکنت، شہریار، بشیر بدر، ظفر اقبال، احمد مشتاق، وغیرہ نے غزل کی آبیاری کی اور اس فن کو آگے بڑھایا۔

غزل گو شعرا کا تذکرہ

میر تقی میرؔ

حالاتِ زندگی۔

میر کا شمار اردو کے عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ان کا نام محمد تقی تھا۔ولادت آگرہ میں ۱۷۲۳ء میں ہوئی۔میر کے والد محمد علی صوفی منش انسان تھے اور معاملات دنیا سے سروکار نہ رکھتے تھے۔صوفیا کی خدمت میں حاضری کو سعادت جانتے تھے۔ علی متقی اپنے بیٹے محمد تقی کو اپنی راہ پر چلانے کی تمنا رکھتے تھے۔شیر خوار بچے کو اپنی گود میں لے کر ٹہلتے تو کہا کرتے بیٹا عشک کرو عشق کیوں کہ عشق کے سوا دنیا میں کچھ نہیں۔محمد تقی نے ابی پوری طرح سے ہوش بھی نہ سنبھالہ تھا اور ان کی عمر ابھی گیارہ برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ والد کی سایہ سر سے اٹھ گیا اور منھ بولے چچا امان اللہ نے بھی دنیا کو خیر آباد کہہ دیا۔اب میر بالکل بے سہارا رہ گئے۔سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن سے حُسنِ سلوک کی امید ہوسکتی تھی مگر باپ کے مرتے ہی انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔

محمد تقی روزی کی تلاش میں آگرہ سے دہلی پہنچے۔میر اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں خان آرزو کی صحبت میں بھی رہے جہاں میر نے بہت کچھ سیکھا۔میر اکثر بدحالی کے شکار رہے۔دہلی اجڑی تو میر لکھنو آ کر نواب آصف الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔عمر کے آخری اکتیس ۳۱ برس گزار کر ۱۸۱۰ء میں جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔

میر کی غزل گوئی:

میر تقی میر غزل کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ان کی استادی کا اعتراف غالب نے یوں کیا ہے۔

ریختے کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب　　　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

انہوں نے میر کے دیوان کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ ان کا دیوان گلشن کشمیر سے کم نہیں ہے۔غالب ہی کی طرح دوسرے شعرا نے بھی میر کے باکمال شاعر ہونے کی توثیق کی ہے۔غزل میں میر نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ روایتی نہیں بلکہ تازہ کار ہے۔ان کی زبان ہندوستانی سرزمین کی بوباس رکھتی ہے۔میر کی شاعری میں متصوفانہ خیالات وتجربات کا بھی نمایاں طور پر اظہار ملتا ہے۔اس کے نزدیک دل نسخہ تصوف ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دل عجب نسخہ تصوف ہے　　　　ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

میرؔ کے علامتی اشعار وقت، عمر، عصر، آشوب، آگہی، جُدائی اور اجاڑپن کے معانی کا اشاریہ ہیں۔مختصر یہ کی میرؔ ایک عظیم غزل گو شاعر ہیں جن کا شعری اسلوب منفرد اور جداگانہ ہے۔کہتے ہیں۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے

خواجہ حیدر علی آتش

حالات زندگی:۔

آتش کا نام خواجہ حیدر علی آتش تھا۔دہلی کے ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد خواجہ علی بخش نے دلی کی افراتفری کو دیکھتے ہوئے فیض آباد کا رُخ کیا اور یہاں محلّہ مغل پور میں سکونت اختیار کی۔آتش کی پیدائش فیض آباد ہی میں ۱۷۷۸ء میں ہوئی۔آتش ابھی کم سن تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔بعد میں کہیں صاحب علم امیروں اور رئیسوں کی صحبت میں رہ کر فارسی اور عربی میں خاصی دستگاہ پیدا کر لی۔آتش کو مصحفی کی شخصیت بھا گئی۔مصحفی کی شاگردی اور لکھنو کی شعری وعلمی صحبتوں اور دن رات کی محفلوں نے آتش کی صلاحتوں کو نکھار

دیا۔ بادشاہ وقت کی جانب سے آتش کو اسی ۸۰ روپے مہانہ ملنے لگے۔ ان کا یہی ذریعہ معاش تھا۔

آتش کا مسلک صلح کُل تھا ہندو مسلم سب سے خلوص سے پیش آتے تھے۔ آخری زمانے میں بینائی سے محروم ہو گئے۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۱۸۴۷ء کی بات ہے کہ ایک روز بھلے چنگے بیٹھے تھے کہ اچانک داعی اجل کو لبیک کیا۔

غزل گوئی۔

جن شاعروں کی وجہ سے دبستانِ لکھنو کا وقار اور اعتبار قائم ہے ان میں ایک آتش بھی ہیں۔ اپنے صوفیانہ مزاج کی وجہ سے آتش نے دنا کو کبھی مزرعِ آخرت سے بڑھکر اہمیت نہیں دی۔۔ یہ چیز دبستان لکھنو کے شاعروں میں انھیں امتیاز حثیت کا مالک بنا دیتی ہے۔ تصوف ان کی شخصیت میں رچا بسا تھا جس کی وجہ سے ان کے کلام میں اخلاقی بصیرت اور زندگی کی اعلیٰ وارفع قدروں سے جزباتی اور والہانہ وابستگی ملتی ہے۔ اس طرح آتش کے کلام میں فقیرانہ اور آزادانہ شان پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
بت خانہ کھوڈا لیے مسجد کو ڈھایئے — دل کو نہ توڑیئے خدا کا مقام ہے

آتش کی غزل میں زبان کا حُسن اور جزبے کی صداقت دونوں گھل مل جاتی ہیں اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع سازی کا۔

یہی مرصع سازی ہے جس نے لکھنو کو دہلی سے ممتاز کر دیا لیکن آتش کی اصل اہمیت اس میں ہے کہ مرصع سازی کے علاوہ بھی ان کی شاعری میں بہت کچھ ہے۔

اسداللہ خان غالبؔ

حیات:۔

نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا نوشہ، اسداللہ خان غالبؔ بہادر نظام جنگ اردو زبان کے سب سے بڑے شاعروں میں سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا کے آباواجداد میں مرزا کے دادا مرزا قوقان بیگ سمرقند سے ہجرت کر کے مغل شہنشاہ بہادر کے عہد حکومت میں غالباً ۱۷۵۰ء میں مغلیہ سلطنت میں آ کر آباد ہوئے ۱۷۹۳ء میں غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان کا عقد آگرہ کے ایک فوجی آفسر خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوا۔ اور اس طرح غالب کی پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو کالا محل، آگرہ میں پیدا ہوئے۔ غالب کے والد الور کی لڑائی میں ۱۸۰۱ء میں قتل ہوئے۔ والد کی موت کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا مرزا الفراللہ بیگ خان نے کی۔ غالب کی عمر صرف ۹ برس کی تھی کہ چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ایسے میں ان کی پرورش ان کے ننھیال میں ہونے لگی۔ غالب نے ایک مختصر سی مدت کیلیئے آگرہ کے مولوی معظم کے مکتب میں تعلیم حاصل کی تھی۔ غالب ابھی ۱۳ برہی کے تھے کہ الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ۱۸۱۰ کو دہلی میں ان کا نکاح ہو گیا۔ سرکار انگریز کی طرف سے مرحوم چچا کے وارثوں کی پنشن مقرر ہو گئی جس میں سے سات سو روپیہ سلانہ مرزا کو بھی ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو انگریزی سلطنت نے مرزا کو باغیوں میں شمار کر کے پنشن بند کر دی۔ مغل سلطنت کا تو خاتمہ ہو ہی چکا تھا۔ مرزا کی گذر بہت مشکل ہو گئی۔ سو روپیہ مہانہ نواب رامپور کی سرکار سے ملتا تھا۔ اپنی پنشن کی بحالی کے لئے غالب نے کلکتے کا بھی سفر کیا لیکن پنشن کی بحالی میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد مارچ ۱۸۶۰ء میں انگریزی سرکار سے پنشن بحال ہو گئی۔ پنشن کے ساتھ ساتھ تین سال کا بقایا ساڑھے سات سات سو روپے سالنہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے مل گیا۔ اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت کا اعزاز بھی بحال ہو گیا۔ غالب کو اپنے حسب ونسب اور اپنے شاعرانہ رتبے دونوں پر ناز تھا۔ وہ شاہانہ زندگی گزارنے کے خواہشمند تھے مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

وفات:۔آخر۱۴فروری۱۸۶۹ءکودوپہر سے ہوشی رہی، تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔لگ بھگ چوبیس گھنٹے یہی کیفیت رہی اورآخر۱۵فروری ۱۸۶۹ءکودن ڈھلے غالب نے آخری سانس لی اوردہلی کے حضرت نظام الدین اولیامیں تدفین عمل میں آئی۔

حاؔلی کے الفاظ میں:

شہرمیں اک چراغ تھانہ رہا　　　　اک روشن دماغ تھانہ رہا

غالبؔ کی غزل گوئی۔

غالبؔ اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں۔اُس کی عظمت کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے اردوغزل کوسوچناسکھایا۔اسے غوروفکر کی عادت ڈالی۔انھوں نے حیات وکائنات کے بارے میں اپنے افکارکو بڑی گہرائی کے ساتھ موثرانداز میں پیش کیا۔اس لحاظ سے وہ اپنے عہد کے جدید شاعر تھےاورایک سائنسی ویژن بھی رکھتے تھے۔ان کی حکیمانہ نظراپنے عہد سے بہت آگے تھی۔انھوں نے آنے والے دور کے قدموں کی چھاپ سن لی تھی یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں آج کے عہد کی زندگی اوراس کے مسائل کاپرَتو بھی جھلکتا ہے۔

نمونہ کلام۔۔۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　　　پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کوئی امید بھرنہیں آتی　　　　کوئی صورت نظرنہیں آتی

بس کہ دشوار ہے ہرکام کا آساں ہونا　　　　آدمی کوبھی میسرنہیں انسان ہونا

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہرخواہش پہ دم نکلے　　　　بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھربھی کم نکلے

غالبؔ کا انداز بیان ہی ہے جس نے ایک عالم کوگرویدہ کرلیا ہےان کے اشعار کاڈکشن منفرد ہے۔اس کی مثال کہیں اورنہیں ملتی۔وہ اپنے انداز بیان پرناز کرتے ہوئے آتے ہیں

ہیں اوربھی دنیامیں سخن ور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیاں اور

غالبؔ کی شاعری اتنی تہہ درتہہ،ایسی پہلودار اور طلسمی ہے کہ اس کی تفہیم قائم کیے جاسکیں گےاور محققین ،ناقدین اورشارحین کیلئے ایک نیا افق اور ایک نئی دنیاسامنےآتی رہے گی اور یہ سلسلہ چلتارہے گا۔غالب کا دعوئ بے جانہیں کہ۔

گنجینہ ،معنی کاطلسم اس کوسمجھے جولفظ کہ غالب میرے اشعار میں آیے

غالب نے غزل کے علاوہ اوراصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ غزل اورصرف غزل کے شاعر تھے۔بقول رشید احمد صدیقی ..غزل اگراردوشاعری کی آبرو ہےتوغالب اردوغزل کی آبرو ہیں۔

مومن خان مومنؔ

حالات زندگی؛

محمد مومن خان نام اورتخلص مومنؔ تھا۔حکیم غلام نبی خان کے بیٹے تھے۔خاندانی پیشہ طبابت تھا۔مومن ۱۸۰۰ءکودہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کو

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بہت عقیدت تھی۔ چناچہ شاہ صاحب موصوف نے ہی مومن خان نام رکھا۔ مومن بچپن سے ہی ذہین طبع تھے۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ عربی، فارسی، نجوم اور موسقی میں جلدی کمال حاصل کرلیا۔

دلی سے مومن پانچ مرتبہ نکلے مگر وطن کی محبت نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مومن نہایت آزاد مزاج، قانع اور وطن پرست تھے۔ امرا اور وساء کی خوشامد سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلئے شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ کسی دربار سے بھی وابستہ نہیں ہوئے۔ شاہ نصیر سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ آکر کار مذاقِ سخن ہی نے رہبری کی۔

غزل گوئی:

غزل مومن کا اصل میدان ہے۔ وہ خالص عشقیہ شاعر تھے۔ مطلب ان کی غزل کا دائرہ حسن و عشق تک محدود ہے۔ لیکن اس محدود دائرے میں رہ کر انہوں نے ایسے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے کہ آج اتنا زمانہ بدل جانے کے بعد بھی اہلِ نظر ان کی غزل پر فریفتہ ہیں۔ مومن نے معاملات عشق کو ہمہ رنگ انداز میں پیش کرنے کے ساتھ عشق کی متنوع کیفیات اور جزبات کی منہ بولتی تصویر کشی کی۔ مومن کا اسلوب منفرد ہے اور ایمائیت ان کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
میں بھی خوش نہیں وفا کرکے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی۔

مختصر یہ کہ مومن نے عاشقانہ مضامین ایسے دلکش انداز میں پیش کیے ہیں کہ قدم قدم پر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے تغزل کی نرالی شان پیدا ہوگئی ہے۔ انھیں تشبیہوں اور استعاروں کے برتنے کا بہت سلیقہ ہے۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کلام مومن کی اہم خصوصیات ہیں۔

حسرت موہانی

حالات زندگی:

سید فضل الحسن نام حسرت تخلص موہان (ضلع اناو) وطن تھا۔ اس مناسبت سے حسرت موہانی کہلائے۔ موہان ہی میں ۱۸۸۱ء میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مزید تعلیم کے لئے علی گڈھ آئے اور یہیں سے بی۔اے کیا۔ شعر و ادب کے علاوہ سیاست کی طرف بھی مائل ہوئے۔ علی گڈھ کی مقامی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ یونیورسٹی انتظامیہ عموماً ان سے ناخوش ہی رہی اور وہ بار بار معتوب ہوئے

حسرت کی زندگی کے دو رخ ہیں ایک شعر و ادیب کا کہ نہایت اہتمام سے شعر کہتے ہیں۔ نکات سُخن لکھ کر اردو ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ پابندی سے رسالہ نکالتے ہیں۔ دوسری طرف سیاست سے کسی طرح کنارہ کش نہیں ہوتے۔ مزاج میں بے باکی اور صاف گوئی ہے۔ اس لئے خلافت کانفرنس ہو، کانگرس ہو، یا مسلم لیگ کوئی انھیں برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ بہر حال وہ اپنی راہ چلتے رہے۔ مکمل ازادی کا ریزلیشن پیش کرنے والا یہی علی گڈھ کا مرد مجاہد تھا۔ آخر حسرت نے ۱۲ مئی ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔

غزل گوئی۔

حسرت نے اس وقت غزل کو ایک نیا وقار عطا کیا جب اردو غزل کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوگئی تھیں اور حالی نے غزل پر سخت اعتراض کئے تھے۔ اس ماحول میں حسرت نے برملا اعلان کیا۔ رقم الحروف کی طبیعت نے اپنے لیے اصناف سخن میں غزل کو اپنے حسبِ حال پاکر منتخب کرلیا ہے۔ ان کا

ایک شعر ہے۔

لکھتا ہوں مرثیہ، نہ قصیدہ، نہ مثنوی   حسرت غزل ہے صرف مری جانِ عاشقاں

حسرتؔ کے کلام میں اساتزہ کا رنگ جھلکتا ہے مگر ان کی آواز صاف پہچانی جاتی ہے۔ وہ حسن پرست بھی ہیں اور عاشق مزاج بھی۔ ان کا عشق خالص عشقِ مجازی ہے جس میں کسی حد تک ہوسنا کی بھی شامل ہے۔ حسرت کہتے ہیں۔

حسرت مرے کلام میں مومن کا رنگ ہے   ملکِ سخن میں مجھ سا کوئی دوسرا نہیں

مومن کی غزل کی طرح کلام حسرت میں بھی عشق کی ساری کیفیتیں اور حسن کے سارے روپ نظر آتے ہیں۔ کلام حسرت کا مطالعہ کیجئے تو عشق ومحبت کی ساری وارداتیں اپنی تمام دلکشی کے ساتھ اس میں سمٹ آتی ہے۔

حامدی کاشمیری

حیات:

حبیب اللہ نام، حامدیؔ تخلص، 1932ء میں بازار مسجد بہوری کدل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم ایک مقامی پرائمری سکول میں حاصل کی۔ مڈل اور میٹرک امتحانات پاس کرنے کے بعد ایس۔ پی کالج اور امر سنگھ کالج سے انٹر اور بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ پھر کشمیر یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ایس پی کالج میں انگریزی کے لیکچرر کا منصب سنبھالا۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی سولن سے اُردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لیکچرر بنائے گئے۔ حامدیؔ صاحب کلچرل اکیڈیمی کے اسسٹنٹ سیکریٹری بھی رہے۔ شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی میں حامدی صاحب ریڈر اور بعد میں سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ ملازمت کے آخری تین برسوں میں حامدیؔ صاحب کشمیر یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے اونچے عہدے پر فائز رہے۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۱۸ء کو شالیمار سرینگر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

ادبی خدمات:

حامدی صاحب نے عمدہ غزلیں اور نظمیں لکھیں ہیں۔ وہ افسانے لکھنے کے علاوہ ناول بھی لکھتے ہیں۔ تنقید میں بھی اُنہوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ حامدی صاحب کی پچاس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تیں تنقیدی کتابیں، دس شعری مجموعے، تین افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور ایک سفرنامہ بھی شامل ہے۔ حامدی صاحب کو کئی ریاستی اور ملکی اعزازات وانعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔

طرزِ تحریر:

حامدی کی نظمیں بہت ہی خوب صورت ہیں اُن کی غزلوں میں مقامی رنگ نمایاں ہے۔ فکر اور اسلوب کے کچھ جدید آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض غزلوں میں روایتی انداز ہے۔ اُن کا اسلوب سادہ ہے۔ اُن کے کلام میں کشمیر کے حسن اور فطری مناظر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ روایتی شاعری اور رومان بھی نظر آتا ہے۔ احساس اور شعور کی گہرائی بھی کہیں کہیں ملتی ہے۔

پروین شاکرؔ

حالاتِ زندگی

پروین شاکرؔ کی پیدائش 24 نومبر 1952ء کو کراچی میں ہوئی۔ والد کا نام سید ثاقب حسین تھا جو خود شاعر تھے اور شاکر تخلص کرتے تھے۔ پروین

شاکر کا ابتدائی تخلص ''بینا'' تھا لیکن بعد میں پروین شاکر کے نام سے شہرت ملی۔ پروین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ پھر رضیہ گرلز ہائی اسکول میں داخل ہوئیں۔ جہاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سرسید گرلز کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے پہلے انگریزی اور پھر لسانیات میں ایم۔ اے کیا۔ 1971ء میں انہوں نے ''جنگ میں ذرائع اِبلاغ کا کردار'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے بینک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کیا۔ تعلیمی سلسلہ ختم کرنے کے بعد پروین پہلے عبداللہ گرلز کالج میں انگریزی کی لیکچرر ہوئیں اور نو سال تک درس و تدریس کا کام انجام دیتی رہیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے سول سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئیں۔ ان کا تقرر محکمہ کسٹمز میں بطور کسٹم کلکٹر ہوا۔ ان کی شادی ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی۔ لیکن یہ رشتہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔ پروین کا انتقال 26/دسمبر 1994ء کو اسلام آباد پاکستان کے نزدیک ایک سڑک حادثے میں ہوا۔ اُنہوں نے کُل بیالیس برس کی عمر پائی اور ستائیس برس تک شاعری کی۔

ادبی کارنامے

پروین نے پندرہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی۔ غزلوں کے علاوہ انہوں نے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے 1977ء ''خوشبو''، 1981ء ''صد برگ''، 1984ء ''خود کلامی'' اور 1994ء میں ''انکار'' اور ''کفِ آئینہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلیات ''ماہ تمام'' کے نام سے 1994ء میں شائع ہو چکا ہے۔

طرزِ تحریر

پروین شاکر کے یہاں آورد نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں احساسات ہی احساسات ہیں اور یہ احساسات عورتوں کے مخصوص حالات پر مبنی ہیں۔ ان کے یہاں عورتوں کے جذبات کا ایک نیا میلان ہے۔ ان کے یہاں روایت کا تسلسل ملتا ہے تو دوسری طرف انحراف بھی سامنے آ جاتا ہے۔ ان کے یہاں حسرت و ہیجان، ہجر، ملال، رنج، جدائی، انتظار، یاس، عورتوں کے استحصال، بے وفائی، نا کامی، محرومی، وصل و فراق کے عنوانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

خلاصہ:-

اس اکائی میں غزل سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ غزل کا پورا مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ غزل میں رمزیت اور ایمائیت کتنی اہم ہے اس کو بھی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ غنائیت سے غزل کی دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے اس کا بھی ذکر ہوا ہے۔ غزل میں معنوی تہہ داری ہوتی ہے یہ خصوصیت غزل میں تشبیہہ، استعارہ، مجازِ مرسل، کنایہ اور صنائع کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ غزل کے مختلف موضوعات پر بھی بات ہوئی ہے۔ آخر پر غزل کے ارتقاء پر مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور اردو شعرا کے حالات زندگی اور ان کی غزل گوئی پر اجمالی گفتگو کی گئی ہے۔ شعرا کی غزلوں کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ خود مطالعہ کی جانچ کے لئے چند سوالات دیئے گئے ہیں اور فرہنگ میں مشکل الفاظ کے معنی بھی بتائے گئے ہیں۔ مطالعاتی مواد کو تیار کرنے کے دوران جن ماخذات سے مدد حاصل کی گئی ہے ان کا حوالہ بھی نیچے دیا گیا ہے۔

جانچ

۱۔ ہرن کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟

۲۔ غزل کی زمین سے کیا مراد ہے؟

۳۔ بیت الغزل سے کیا مراد ہے؟

۴۔ غیر مردف سے کیا مراد ہے؟

۵۔ کیا غزل کا شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے؟

۶۔ صنعتِ حسن تعلیل کسے کہتے ہیں؟

۷۔ اردو غزل گوئی کی ابتدا کس سے ہوئی؟

۸۔ دکن کے دو مشہور شعرا کے نام لکھیے۔

۹۔ غزل کے سنہری دور کے شعرا کے نام بتایئے۔

۱۰۔ غالب نے غزل کو کس سے آشنا کیا؟

۱۱۔ ذوق نے کس پر زیادہ زور دیا؟

۱۳۔ آتش کا پورا نام لکھیے۔

۱۴۔ غالب کی بیوی کا نام کیا تھا؟

۱۵۔ غالب دہلی میں کہاں مدفون ہیں؟

۱۶۔ غالب کو انگریزی سرکار سے سالانہ کتنی پنشن ملتی تھی؟

۱۷۔ مومن خان مومن کا خاندانی پیشہ کیا تھا؟

۱۸۔ حسرت موہانی نے اعلیٰ تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

کتابیات

۱۔	تاریخ ادب اردو	پرفسر نورالحسن نقوی
۲۔	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سنبل نگا
۳۔	اردو اصناف کی تدریس	اومکار کول ،مسعود سراج
۴۔	اردو وِکی پیڈیا	https://ur.m.wikipedia.org
۵۔	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	فرمان فتحپوری
۶۔	غزل اور غزل کی تعلیم	اختر انصاری
۷۔	مطالعہ اصناف ادب	شاہ فیصل

دبستانِ دلی

1۔ تمھید :

دلی، بقولِ میر تقی میرؔ

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

دلی کا نام سنتے ہی ایک تاریخ آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ دلی جہاں اپنی تہذیب، تمدن، ثقافت، زبان، عمارتوں اور قعلوں کے لئے مشہور ہے وہی اس شہر کا بار بار اُجڑنا اور پھر بار بار بسنا بھی اس کی تاریخی رنگارنگی کا دلکش حصہ ہے۔ ہندوستاں کا دل کہلانے والی دلی میں جو آیا وہی کا ہو کے رہ گیا۔ اس شہر نے بڑے بڑے بادشاہوں اور حکومتوں کا عروج اور جاہ وجلال بھی دیکھا ہے اور بڑے بڑے ظالموں اور جابروں کا ظلمِ و جبر بھی سہا ہے۔ اس شہر کو بسانے

اورسجانے والوں کا اب اتہ پتہ نہیں۔اس شہر کواجاڑنے اور برباد کرنے والوں کا نام ونشان باقی نہیں ہے لیکن دلی اپنی تمام رعنائیوں اور بدصورتی کے ساتھ اپنی جگہ موجود ہے۔ یہاں کےلوگوں کی مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان دانی بھی عالم میں مثال ہے۔اس شہر نے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور عالم پیدا کئے۔ یہ شہر بڑی بڑی زبانوں کی جنم بھومی ہے۔اردو نے بھی اسی شہر میں جنم لیا اور دنیا میں پھیلی۔اردو کے بڑے بڑے شعراءاس شہر کی مٹی سے مانندِ پھولے اور اپنی مہک سے پورے عالم کومعطر کیا۔ یہ میؔر و غالبؔ اور مومنؔ کی دلی ہے۔دلی کا طرزِ زندگی باقی ہندوستان سے اکثر اوقات الگ ہی رہا ہے۔خواہ زندگی آرام سے گذری یا مصائب سے دوچار رہی ،زندگی کا رنگ باقی ملک سے الگ ہی رہا ہے۔یہی حال شاعری کا بھی رہا ہےاور اردو شاعری کا بھی۔اردوشاعری کے اسی الگ رنگ کودبستانِ دلی کہتے ہیں۔اس اکائی میں ہم اسی کے بارے میں بات کریں گے۔یعنی دبستانِ دلی کے آغاز وارتقاءاور اس کی خصوصیات کی بات۔

مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے درجِ ذیل مقاصد ہوں گے۔

ا۔ طالبِ علم دلی کی شعری روایات کا احاطہ کریں۔

۲۔ طلاب دبستانِ دلی کے آغاز وارتقاء کا جائزہ لیں۔

۳۔ طلاب دبستانِ دلی کی خصوصیات کو پہچان سکیں۔

آموزشی ماحصل

ا۔ طالبِ علم دلی کی شعری روایات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

۲۔ طلاب دبستان دلی کے آغاز وارتقاء پر گفتگو کرتے ہیں۔

۳۔ طالبِ علم دبستانِ دلی کا پسِ منظر بیان کرتے ہیں۔

۴۔ طلباء وطالبات دبستانِ دلی کے شعراء کے بارے میں جانتے ہیں۔

۵۔ طالبِ علم دبستانِ دلی کی شاعری کے امتیازات بیان کرتے ہیں۔

اصلی موضوع

دبستانِ دلی کا پسِ منظر:

دبستاں کسی خاص ماحول اور حالات میں دجود میں آنی والی یک رنگ شاعری کو کہا جاتا ہے۔ دبستاں میں چند اصولوں کی پابندی لازمی ہے۔جیسے تلمذ یعنی شاگردی ،موضوعات اور اسلوب کی پابندی۔

دلی، ہندوستان کا دل کہلانے والا یہ شہر شعروشاعری کا مرکز رہا ہے۔ یہاں فنونِ لطیفہ کی جیتی جاگتی تصویریں ہرراہ اور ہر گام لوگوں کا من موہ لیتی ہیں۔ یہ شہر کئی بار لٹا اور بار بار بسا۔اس شہر نے صدہا مصائب دیکھےاور ہمیشہ ان کا مقابلہ کیا۔ 1707ء سے 1719ءتک دہلی کے تخت پر کئی بادشاہ بیٹھے۔ اورنگ زیب کے بعد اُن کے فرزند معظم پھر اُن کے بھائی معزالدین اور پھر سید برادارن نے دہلی پر حکومت کی۔محمد شاہ رنگیلا کے عیاشی کے دور میں احمد شاہ درانی نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ چونکہ مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھااس لئے مرہٹے، جاٹ اور روہیلے بھی دہلی پر قابض ہونے کی غرض سے حملہ آور ہوئے۔اس ساری صورتحال نے دہلی کے سیاسی ،سماجی اور معاشی حالات مخدوش کردیئے۔ مغل سلطنت سمٹتے سمٹتے بس دلی تک محدود رہ گئی اور آخر کار انگریزوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کوٹھکانے لگا کر دلی کوتاخت وتاراج کر کے اس پر

قبضہ جمایا۔ ان بکھرتے حالات نے دلی کے عوام کو بہت حد تک متاثر کیا۔ لوگ ڈر اور خوف کے ماحول میں جیتے رہے۔ ناامیدی، یاسیت اور پریشانی لوگوں کا مقدر بنی۔ کچھ لوگ دُنیا سے بے نیاز بس یاد اللہ میں محو ہو گئے۔ یعنی ہر طرف ویرانی سی ویرانی نظر آتی تھی۔ ایسے حالات سے بلا شاعر کیوں کر محفوظ رہتا۔ دلی کے شعراء کے یہاں بھی ان ہی حالات اور ان سے اُبھرنے والے جذبات کا مظاہرہ ملتا ہے۔ اِسی قبیل کی شاعری نے ایک الگ دبستان کو جنم دیا۔ جس کو ہم ''دبستانِ دلی'' کہتے ہیں۔

دبستانِ دلی آغاز وارتقاء:

دہلی شعر وشاعری کا مرکز تو پہلے ہی تھی لیکن ۱۷۰۰ء میں وؔلی کے دہلی آنے اور ۱۷۱۹ء میں ان کا دیوان یہاں پہنچنے کے بعد دہلی کے شعراء کو جو فارسی میں شعر کہتے تھے احساس ہوا کہ عام بول چال کی زبان جسے گری پڑی زبان سمجھا جاتا ہے اور جسے ریختہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں بھی ایسے شعر کہے جاسکتے ہیں جس سے عوام اور خواص دونوں لطف اندوز ہو سکیں۔ چانچہ اس زبان میں جو آگے چل کر اُردو کہلائی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ خان آرزؔو، آبرؔو، حاتؔم، شاکؔر، ناجؔی، مضمونؔ، بیاںؔ، امیدؔ، مخلصؔ اس دور کے خاص شعراء ہیں۔ یہ دور شمالی ہندوستان میں اردو شعرای کا ابتدائی دور تھا۔ اس دور کے بعد میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودؔا کا دور آیا۔ اس دور میں اردو شاعری نے زبان وبیان کے اعتبار سے بہت ترقی کی۔ اسی دور میں دہلی کے سیاسی حالات میں زبردست اتھل پتھل مچ گئی۔ اہلِ علم اور اہلِ قلم جان بچا کر دہلی چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ پہلے محمد شاہ درانی اور پھر احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دہلی کو تباہ کر دیا۔ لیکن دلی تھی کہ اجڑنے کے بعد پھر بستی رہی اور لوگ واپس آ کر پھر گزارا کرتے۔ ناامیدی، یاسیت، غم، مصیبت، آلام، افلاس، دنیا کی ناپیداری اور بے بسی اور بے کسی اس دور کی شاعری کے موضوعات رہے۔ میر جیسے شاعر کو شاعرِ غم کہا گیا اور غم ہی اُس کی شاعری کا محبوب موضوع رہا۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا
مجھ کو شاعر نہ کہو کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے جمع کئے اور دیوان کیا

اس دور کے ایک اور شاعر خواجہ میر دردؔ کا محبوب ترین موضوع تصوف ہے۔ خارجی کیفیات کے بجائے داخلی جذبات کا بیان بھی دلی کے شعراء کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ چونکہ ہندستان میں اردو شاعری کے دوسرے مراکز جن میں لکھنو اور دکن قابل ذکر ہیں، میں اس رنگ کی شاعری نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے دلی کی اس انفرادیت کو ''دبستانِ دلی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ دلی دبستان کی زبان میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔

دبستان دلی کا اہم دور مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور حکیم مومن خاں مومنؔ کا ہے۔ یہی دور اردو غزل کا عہدِ زریں بھی کہلاتا ہے۔ اسی دور میں دلی کے شعری دبستان نے ترقی کی انتہاوں کو چھو لیا۔ اس کے بعد غالبؔ اور مومنؔ کے شاگردوں کا دور آتا ہے یہی دور دبستانِ دلی کا آخری دور کہلاتا ہے۔

دبستانِ دلی کے مختلف ادوار اور شعراء:

پہلا دور : اس دور میں دلی کی شاعری میں ایہام گوئی کا چرچا خوب رہا۔ اس دور کے شعراء میں مضمونؔ، یک رنگؔ، آبرو، حاتؔم، ناجؔی وغیرہ اہم مانے جاتے ہیں۔

دوسرا دور: اس دور میں دلی کی زبان میں صفائی اور سادگی پنپنی شروع ہوئی۔ مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر دردؔ، میر تقی میر، میرزا

محمد رفیع سوداؔ وغیرہ اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں۔اس دور کو شعرائے معتقدمین کا دور کہا جاتا ہے۔اس دور میں اردو شاعری نے موضوع، اسلوب، زبان و بیان اور اصنافِ سخن ہر لحاظ سے اتنی ترقی کی کہ شعرائے متاخرین نے بھی اس سے استفادہ کیا۔ یہ اردو شاعری کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔

تیسرا دور: اس دور کے شعراء میں مصحفیؔ، انشاء، جراتؔ اور رنگین شامل ہیں۔انہوں نے موضوع اور مضامین کے اعتبار سے اردو شاعری کو وسعت عطا کی۔ یہ شاعر جب لکھنو چلے گئے تو پھر وہی کے رنگ میں رنگ گئے۔لیکن مصحفیؔ نے وہاں بھی دہلوی رنگ برقرار رکھا۔

چوتھا دور: اس دور میں شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور ظفرؔ نے اردو شاعری کو عظمت عطا کی۔اس دور کو اردو غزل کا ''عہدِ ذریں'' بھی کہا جاتا ہے۔اس دور میں دلی کی شاعری خاصکر غزل نے ہر لحاظ سے ترقی کی۔یہی دور اصل میں دہلی کا نمایندہ دور کہلاتا ہے۔زبان و بیان، اسلوب، موضوعات اور سلاست و روانی میں دہلی کی اردو شاعری عالمی شاعری کی ہم پلہ ہوگئی۔

آخری دور: اس دور میں داغؔ، حالیؔ، ظفرؔ، سالکؔ، ظہیرؔ، مجروحؔ، شیفتہؔ وغیرہ نے اردو شاعری کے دامن کو وسعت عطا کی۔اس کے بعد بیسویں صدی کی یلغار نے عالمی اصولوں پر شاعری کے پیمانے طے کئے۔

دبستانِ دلی کی خصوصیات:

دبستان دلی کی خصوصیات درجِ ذیل ہیں۔

غم: غم دہلی کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ چونکہ دلی کے شاعر مصائب و آلام سے عمر بھر لڑتے رہے اور عیش و نشاط کا دلی میں دور دورہ کم ہی رہا۔اس لئے یہاں کی شاعری کا محبوب موضوع غم ہے۔

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے (میرؔ)

غم اگر چہ جاں گسل ہے پر کہاں بچے کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا (غالب)

جذباتِ عشق کا اظہار: عشق دلی کا شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے۔ یہاں کے شعراء نے عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی کے جذبات کا بھی اظہار کیا۔ یہاں کے شعراء نے عشقِ مجازی کے بیان کے دوران نفاست اور صداقت کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ یہاں عشقیہ جذبات کے بیاں کے دوران رقاقت اور ابتزال پایا نہیں جاتا ہے۔عشق میں اخلاق کا دامن پکڑے رکھنا دلی کے شعراء کا خاصا ہے۔ یہاں وصال سے زیادہ ہجر کا ذکر ملتا ہے۔

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے (میرؔ)

حزن و یاس: نا اُمیدی، حزن اور رنج و الم دہلی کی شاعری کی نمایاں خوبیاں ہے۔ یہاں کے حالات کے پیشِ نظر دلی کے شاعر نا امیدی اور یاسیت میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا(میرؔ)

واردات قلبی:

دلی کے شعراء خارجی کے بجائے داخلی جذبات کا زیادہ اظہار کرتے ہیں۔ باہری تجربات اور مشاہدات کو دل کی بھٹی میں سلگا کر قلبی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ دلی کر شعراء کا یہ ایک خاصہ اور یہاں کی شاعری کا وصف ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائیں کیوں (غالب)

تصوف: یہ شعرائے دہلی کا ایک اور خاص اور پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ دلی کے شعراء کے یہاں تصوف کی فراوانی ہے۔ تقریباً ہر شاعر کے یہاں یہ موضوع ملتا ہے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس کے علاوہ دلی کے شعراء کے یہاں رمزیت واشاریت کا کام لیا گیا ہے۔ دلی کا شاعر براہ راست بات کہنے کے بجائے اشاروں اور کنایوں سے کام لیتا ہے۔ سادگی اور صداقت دلی کے دبستان کی چند اور اہم خوبیاں ہیں۔ سادہ خیالات کو سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے پرہیز، سلیس تشبیہات اور استعارات کا استعمال اس دبستان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ زبان کی حیثیت سے دبستانِ دہلی میں سادگی، صفائی، روانی، فصاحت، متانت، شگفتگی اور گھلاوٹ جیسی خصوصیات ملتی ہیں

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومنؔ)

یہی خصوصیات دبستانِ دلی کو اردو شاعری کے باقی اسکولوں سے الگ کرتی ہیں اور دلی کو اردو شاعری کا سب سے زیادہ پُر مایہ اور سب سے بڑا دبستان بناتی ہیں۔

محاکمہ

یہ بات اب عیاں ہے کہ ''دبستانِ دلی'' اردو شاعری کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا دبستاں ہے۔ اس دبستاں نے زبان و بیان اور اسلوب کے حوالے اردو شاعری کو زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ زبان کی حیثیت سے دبستانِ دہلی میں سادگی، صفائی، روانی، فصاحت، متانت، شگفتگی اور گھلاوٹ جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔ دہلی کی شاعری میں تصوف کا ذکر ملتا ہے۔ عشق و عاشقی کا ذکر بھی یہاں کے شاعروں نے خوب کیا۔ یہاں وصال سے زیادہ ہجر کی طلب نظر آتی ہے۔ یہاں کے شعراء نے داخلی واردات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کی شاعری پر درد و غم حاوی ہے۔ شوخی اور زبان کی رنگینی یہاں کم نظر آتی ہے۔ سادہ خیالات کو سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے پرہیز، سلیس تشبیہات اور استعارات کا استعمال اس دبستان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

میرؔ و سوداؔ سے لے کر انشاءؔ و مصحفیؔ تک درجنوں شعراء بالخصوص خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، ظفرؔ وغیرہ دبستانِ دہلی کے نمائندہ شعراء ہیں۔

جانچ:

۱۔ دبستاں سے کیا مراد ہے؟

۲۔ دلی دبستاں کی تین خصوصیات لکھئے؛

۳۔ دبستانِ دلی کے پانچ نمایندہ شاعروں کے نام لکھئے۔

۴۔ اکائی میں درج میرؔ اور غالبؔ کے ایک ایک شعر کی تشریح کیجئے۔

۵۔ کس قسم کے عشقیہ جذبات کا بیاں دبستانِ دلی میں ملتا ہے۔

کتابیات

۱۔	دلی کا دبستانِ شاعری	نورالحسن ہاشمی
۲۔	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	فرمان فتحپوری
۳۔	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار
۴۔	تاریخِ ادب اردو	نورالحسن نقوی

دبستانِ لکھنؤ

تعارف

جب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو ہندوستان کے صوبہ داروں نے خودمختاری کا اعلان کردیا۔ سعادت خان برہان الملک نے اودھ کی بنیا درکھی۔ یہی اودھ بعد میں لکھنو کہلایا۔ نوابینِ اودھ نے لکھنو پر سیاسی ابتری اور زوال کا سایہ بھی پڑنے نہ دیا اس لئے لکھنو میں دلی کے مقابلے میں امن وآشتی اور خوشحالی کا دوردورہ رہا۔ جہاں دلی ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کے نشانے پر رہی ہے وہی لکھنؤ کے نوابوں نے اکثر صلح سمجھوتے سے کام لے کر آرام وآسائش کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب دلی پر آفتیں آتیں دلی کے لوگ ہجرت کر کے لکھنؤ بھاگ جاتے تھے۔ بڑے بڑے شعراء کو بھی جان بچانے کے لئے لکھنو میں پناہ لینی پڑی۔

دلی کے بعد اردو شاعری کا سب سے بڑا مرکز لکھنؤ رہا ہے۔ لکھنو کے لوگوں نے زندگی کا رنگ دلی والوں سے الگ کر کے ایک انوکھے مقابلے کی داغ بیل ڈالی۔ یہ مقابلہ شاعری کے میدان میں بھی رہا۔ یہاں کے شعراء نے ایک مخصوص ماحول اور سماجی حالات کے پیشِ نظر شاعری کا الگ اسلوب اور مضامین کی ایک الگ کھیپ تیار کی۔ یہی موضوعی اور اسلوبی انفرادیت لکھنو دبستان کی پہچان ہے۔ اس اکائی میں ہم دبستانِ لکھنو کی ان ہی خوبیوں اور خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

2۔ مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے درجِ ذیل مقاصد ہوں گے۔

۱۔ طالبِ علم لکھنؤ کی شعری روایات کا احاطہ کریں۔

۲۔ طلاب دبستانِ لکھنؤ کے آغاز وارتقاء کا جائزہ لیں۔

۳۔ طلاب دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات کو پہچان سکیں۔

آموزشی ماحصل

۱۔ طالبِ علم لکھنؤ کی شعری روایات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

۲۔ طلاب دبستان لکھنؤ کے آغاز وارتقاء پر گفتگو کرتے ہیں۔

۳۔ طالبِ علم دبستانِ لکھنؤ کا پسِ منظر بیان کرتے ہیں۔

۴۔ طلباء وطالبات دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کے بارے میں جانتے ہیں۔

۵۔ طالبِ علم دبستان لکھنؤ کی شاعری کے امتیازات بیان کرتے ہیں۔

اصلی موضوع

دبستانِ لکھنؤ کا پسِ منظر

سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا تو دہلی کی مرکزیت بھی ختم ہونے لگی۔ اُردو زبان وادب کے حوالے سے دہلی کے بعد دوسرا اہم مرکز اودھ تھا۔ آصف الدولہ نے لکھنو کو دارالسلطنت بنایا اور واجد علی شاہ نے انگریزوں سے ٹکر لینے کے بجائے مصلحت کا راستہ اختیار کیا۔ لکھنو میں ہر طرف عیش وعشرت اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ ہر طرف راگ ورنگ اور شعر وشاعری کا چرچا تھا۔ دہلی کے اہل علم ودانش ہجرت کر کے لکھنو کی نشاط پرور فضا میں مست ہو گئے۔ میر ضاحکؔ، سوزؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، جراتؔ، انشاؔء اور مصحفیؔ دہلی سے لکھنو آ گئے اور یہیں سے دبستانِ لکھنو کی بنیاد پڑ گئی۔ ناسخؔ اور آتشؔ نے صوری اور معنوی اعتبار سے شاعری کو بالکل بدل کر رکھ دیا اور یوں دبستانِ لکھنو کی مضبوط بنیادیں وجود میں آ گئیں۔

دبستانِ لکھنؤ کا ارتقاء:

خدا آباد رکھے لکھنو کے خوش مزاجوں کو ہر گھر خانہ شادی ہے ہر اک کوچہ ہے عشرت کا

دبستان لکھنو سے مراد شاعری کا وہ رنگ ہے جس سے لکھنو کے شعرائے متعقدمین نے اختیار کیا اور پھر شعرائے متاخرین نے اس کی پیروی کر کے اس کو پروان چڑھایا۔ لکھنو کے دبستان کا رنگ بالکل دلی سے الگ ہیں۔ یہی الگ اور امتیازی رنگ دبستانِ لکھنو کہلاتا ہے۔

سلاطینِ اودھ نے عیش ونشاط کی محفلوں کو پروان چڑھا کر عوام اور صوبے کے لئے امن وامان کا ماحول قائم کیا۔ اس عیش پرستانہ ماحول میں انہوں نے شاعروں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ ملک کے باقی حصوں سے شعراء اور دوسرے اہلِ قلم حضرات باگ کر لکھنو آئے اور یہاں ہی کے ہو لیے۔ راگ ورنگ اور رقص وسرور کی محفلوں کو بہت مقبولیت ہوئی۔ ہر گام اور ہر نکڑ پر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ شاعری کے چرچے ہر طرف پھیلاے گئے۔ امراء، رئیس اور عوام شاعری کے دیوانے ہو گئے۔ اس دبستان کا آغاز مصحفی اور انشاء کے ہاتھوں ہوا۔ چونکہ یہ دونوں دلی سے لکھنو آئے تھے اس لئے ان کی شاعری میں دلی کا اثر پہلے پہل نمایاں رہا۔ لیکن بعد لکھنوی ماحول کے تقاضوں کے مطابق ان کی شاعری میں بھی تبدیلی آئی۔ حالانکہ ان شعراء تک دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری لکھنو کی خارجیت اور رعایت لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ لیکن ان کے بعد ہر معاملے میں لکھنو کے شعراء نے الگ گنگ اختیار کیا۔

دبستانِ لکھنو کی خصوصیات:

دبستانِ لکھنو کی نمائندہ خصوصیات کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے؛

۱۔ خارجیت: لکھنو کی شاعری میں فکر وفلسفہ ناپید ہے اور ظاہر داری پر زیادہ زور ہے۔ دروں بینی اور سوز وگداز کی کمی ہے۔ تصنع اور تکلف لکھنویت کا دوسرا نام ہے۔ حقیقی دنیا کے بجائے خیالی دنیا اور سراپا نگاری کی باتیں ہیں۔ مثال

کتنا شفاف ہے تمہارا پیٹ صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

۲۔ مضمون آفرینی: لکھنوی شاعر روایتی مضامین میں سے نئے نئے مبالغہ آمیز اور عجیب وغریب پہلو تلاش کرتے ہیں۔

جذبات کے بجائے تخیل کی دنیا میں ہی محور ہے۔ مثال

چشمِ بدور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف　　　سبزہ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا

۳۔ معاملہ بندی؛ لکھنو کے شاعر عشق و عاشقی کے واقعات اور وصال کے معاملات کو کھل کر اور مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔ یہاں کے شعراء نے جذبات کی پاکیزگی اور متانت کی دھجیاں اُڑا کر نئے رنگ پیدا گئے۔ معاملات حسن و عشق کے موضوعات کو یوں باندھا کہ پڑھ کر پسینہ آنے لگتا ہے۔ مثال

منہ گال پر رکھنے سے خفا ہوتے ہو ناحق　　　مس کرنے سے قرآں کی فضلیت نہیں جاتی

۴۔ رعایت لفظی: لکھنو میں عوام خواص کو لفظی رعایتوں کا خاصا شوق تھا۔ سب اس کے دیوانے تھے۔ یہ اثر شاعری میں نمایاں رہا۔ یہاں کی شاعری کبھی کبھار صرف لفظوں کا کھیل رہ جاتی ہے۔ لفظی رعایت کے لئے شعر کے مفہوم کو قربان کیا جاتا تھا۔ مثال

وصل کے شب پلنگ کے اوپر　　　مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

۵۔ نسائیت: لکھنوی شاعری کا محبوب موضوع عورت ہیں۔ عورت سے منسلک جذبات کو لکھنو کے شاعر نے مزے لے لے کر بیاں کیا ہے۔ عورت کو لکھنو کے شعراء نے عریاں کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے ہر معشوقہ کو طوائف کی صورت میں پیش کیا۔ اس ضمن میں شاعری کی نئی صنف ریختی وجود میں لائی گئی۔ اس میں صرف عورت کے جذبات بیان ہوتے تھے۔ مثال

اس کے علاوہ لکھنوی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں غزلوں کی طوالت، قافیہ پیمائی، پیچ دار تشبیہہ اور استعارات اور سوز و گداز کی کمی لکھنوی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں تصوف کا نام و نشاں بھی نہیں۔

اس دبستان کے بنیاد گذار نمائندہ شاعروں میں شیخ غلام علی مصحفیؔ، سید انشاء اللہ خاں انشاءؔ، شیخ قلندر بخشؔ، حیدر علی آتشؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ متاخرین میں نمائندہ طور پر برقؔ، محسن کاکورویؔ، دیا شنکر کول نسیمؔ، عزیز لکھنویؔ، مرزا شوقؔ، امیر مینائی، ریاض خیر آبادیؔ وغیرہ کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں۔

محاکمہ

دبستانِ لکھنو کی بنیاد مانو تو دہلوی رنگ کی مخالفت میں پڑی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھنو میں شاعری کی بنیادیں دلی کے شعراء نے مستحکم کیں۔ دہلی کے حالات بگڑے تو اور لوگوں کے ساتھ ساتھ شاعر بھی لکھنو میں جمع ہوئے۔ یہاں کے پرامن ماحول میں شاعری نے نئے بال و پر دکھائے اور نیا رنگ و آہنگ قائم کیا۔

لکھنو کی شاعری میں نشاطیہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ یہاں کے شعری سرمایے میں مسرت کی لہر سی دوڑتی نظر آتی ہے۔ نسوانی حسن کا بھرپور بیان ملتا ہے۔ اُن کے زیور اور لباس کا ذکر بھی جابجا نظر آتا ہے۔ اس طرح اُردو شاعری میں نسوانی حسن کے خدوخال نمایاں ہوئے۔ داخلی معاملات اور وارداتِ قلبی کے بجائے یہاں خارجی معاملات کا بیان ملتا ہے۔ دبستانِ لکھنو کی زبان زیادہ دلکش اور پُرکشش ہے۔ معاملہ بندی، ریختی، قافیہ پیمائی، رعایتِ لفظی، لُغت سازی، غرابت، خوبیٔ بندش اور لطافت اس دبستانِ کی خاص خصوصیات ہیں۔ ناسخؔ، آتشؔ، برقؔ، منیرؔ اور شوقؔ وغیرہ وہ شعراء حضرات ہیں جو دبستانِ لکھنو سے وابستہ رہے ہیں۔

جانچ

درجِ سوالات کے جواب لکھئے۔

۱۔ دبستان لکھنو کی بنیاد کیسے پڑی؟

۲۔ دبستانِ لکھنو کی تین خصوصیات بنیان کیجئے؛

۳۔ دبستان لکھنو کے نمائندہ شعراء کے نام لکھئے

۴۔ نسائیت سے کیا مراد ہے؟

کتابیات

۱۔ لکھنو کا دبستانِ شاعری — ابواللیث صدیقی

۲۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ — انور سدید

۳۔ دبستانِ لکھنو — ای گیان کوش (انٹرنیٹ)

۴۔ آزاد دائرۃ المعروف — انٹرنیٹ

نظم

تمہید :۔

ہم اس امید کے ساتھ بارھویں جماعت کے طلبہ و طالبات سے مخاطب ہو رہے ہیں کہ آپ غالباً بچپن سے ہی اردو نظموں سے مانوس ہیں۔ ابتدائی جماعتوں سے لیکر ثانوی جماعتوں تک آپ نے مشہور نظم گو شعرا کی خوبصورت نظموں کو سنا اور پڑھا ہوگا اور کبھی کبھی اسکولوں میں اسٹیج پر بھی چند دلکش نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھکر دوسروں کے لیے لطف و سرور کا سامان مہیا کیا ہوگا۔ نظیر، آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، چکبست اور اقبال وغیرہ جیسے معروف نظم گو شاعروں سے آپ پہلے ہی آشنا ہیں۔ یہ بھی آپ جانتے ہونگے کہ ان شعرا نے خدا کی وحدانیت، مظاہر فطرت، انسانیت، وطن کی محبت اور دیگر بہت سارے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ غزل کے مقابلے نظمیں ایک عنوان کے تحت لکھی جاتی ہیں۔ غزل اگر اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے تو نظم اردو شاعری کی وسیع ترین صنف ہے کیونکہ اس صنف میں بہت زیادہ تجربے کیے گیے ہیں۔ بے شمار عنوانات پر نظمیں لکھی جا چکی ہیں اور یہی اس کی وسعت کی دلیل ہے۔ گیارھویں اور بارھویں جماعت کے اردو نصاب میں بھی اردو کے کچھ ممتاز نظم گو شعرا کی بڑی معنی خیز نظمیں شامل ہیں جن کا گہرا مطالعہ آپ طالب علموں کیلئے ضروری ہے تاکہ اس سے ایک تو آپ کے جمالیاتی ذوق کو فروغ ملے اور دوسرا آپ کے اندر نئے خیالات، نیک جزبات اور حسین احساسات پیدا ہو سکیں۔

مقاصد :۔

اس اکائی کو پڑھنے سے درجِ ذیل مقاصد پورے ہونگے :

۱۔ طالب علموں کو نظم کے صنفی شناخت، نظم اور غزل کے مابین فرق اور نظم کی تاریخ سے آشنا کرنا

۲۔ طالب علم کے جمالیاتی حسکو بیدار کر کے ان کے اندر شعری ذوق پیدا کرنا

۳۔ طالب علموں کو معروف نظم گو شعرا سے متعارف کر کے ان کو نظمیہ شاعری کی اہمیت و افادیت بتانا۔

آموزشی ماحصل

ا۔ طالب علم نظم کی تعریف، اسکی صنفی شناخت اور تاریخ جانتے ہیں۔

2 ۔طالب علم نظم معریٰ اور آزاد نظم کی جانکاری رکھتے ہیں

3 ۔طالب علم نظمیہ اشعار کو سننا، پڑھنا اور سمجھنا جانتے ہیں

4۔ طالب علم اپنی استعداد کے مطابق نظموں کا خلاصہ اپنے الفاظ میں کرتے ہیں

5۔ طالب علم مختلف نظم گو شعرا اور ان کے کلام پر گفتگو کرتے ہیں۔

6۔ طالب علم نظم خوانی کے فن سے واقفیت رکھتے ہیں۔

نظم کی صنفی شناخت

نظم کا لفظ عام طور سے نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور جملہ اصناف شعری کو بھی نظم ہی کہتے ہیں۔اس اعتبار سے قصیدہ' مثنوی غزل' رباعی اور دیگر اصناف شعری نظم کے تحت آتے ہیں لیکن یہاں نظم سے ہماری مراد وہ مخصوص صنف ہے جسے ہم عام طور پر غزل کے مقابل رکھتے ہیں ۔غزل کی ایک مخصوص ہیت ہے اور نظم کی نہیں۔

نظم کے لغوی معنی 'موتی پرونے' کے ہیں یعنی ایک لڑی میں موتیوں کو پرونا۔خیال وفکر کی شہرازہ بندی تسلسل اور ربط یہی نظم کی پہچان ہے۔غزل کے برخلاف نظم کی ہیت مخصوص نہیں ہوتی لیکن اس کے اشعار میں خیال یعنی مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے کیونکہ نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔

جس طرح نظم کے موضوعات لامحدود ہیں اسی طرح اس کے شکلوں کی تعداد بھی بہت ہے۔مسمط کی ساری شکلیں یعنی مثلث' مربع' مخمسا' مدس' مسبع' مثمن' متسع' معشر سب اس میں شامل ہیں بلکہ بعض جگہ غزل اور مثنوی کا فارم بھی اختیار کیا گیا۔ترکیب بند اور ترجیع بند بھی اس میں شامل ہیں نظم معری اور آزاد نظم معری اثر سے اردو میں رواج پانے والی پیش ہیں گیت بھی نظم کی ایک شکل ہے۔

آیئے اب نمونے کے طور پر یہ دیکھیں کہ نظم نے کون سی شکلیں اختیار کی ہیں

غزل: غزل کا فارم نظم سے قطعی مختلف ہے لیکن نظم نے اس کا اکثر خیال کیا ہے۔مثال کے طور پر اقبال کا ترانہ سارے جہاں سے اچھا ہندستان ہمارا ایک نظم ہے لیکن شاعر نے غزل کا فارم اختیار کیا ہے۔

مثنوی:۔ اقبال کی نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' مثنوی کی شکل میں لکھی گیی۔

ترکیب بند: اس میں غزل کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔نظم کا ہر بند غزل کی شکل میں ہوتا ہے لیکن ہر بند کا آخری شعر دوسرے قافیے میں ہوتا ہے۔

ترجیع بند: یہ ترکیب بند کی طرح ہی ہوتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ترکیب بند میں ٹیپ کا شعر ہر بند میں الگ ہوتا ہے جبکہ ترجیع بند میں ٹیپ کا ایک ہی شعر ہر بند کے آخری میں دہرایا جاتا ہے۔

مستزاد: مستزاد وہ شکل ہے جس میں ہر مصرعے کے بعد ایک چھوٹا سا ٹکڑا بڑھا دیا جاتا ہے۔

قطعہ: قطعے میں غزل کی شکل اختیار کی جاتی ہے لیکن غزل کے برخلاف اس کے معنی ہیں تسلسل پایا جاتا ہیں۔

مسمط: یہ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پرونا۔اس طرح یہ بھی ایک نظم ہو ہی۔اس کے مختلف قسمیں ہیں جو بند کے اشعار کی تعداد کو نظر میں رکھتے ہوئے مقرر کی گیی ہیں۔وہ قسمیں یہ ہیں۔

مثلث ۔مربع۔ مخمس۔مسدس ۔ مسبع۔ مثمن ۔متسع ۔معشر

نظم معرا اور آزاد نظم ۔۔۔۔۔نظم کی دو جدید ہیتیں

عالمی ادب کے اثر سے ہماری شاعری میں بعض نئی ہیتوں کا اضافہ ہوا ہے جن کی تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

نظم معریٰ: نظم معریٰ نظم کی وہ قسم ہے جسے انگریزی میں بلینک ورس کہتے ہیں ۔اس میں قافیے کی پابندی نہیں ہوتی اسلئے شاعر کو آزادی ہوتی ہے۔انگریزی میں اس کے لئے ایک خاص وزن مقرر ہے مگر اردو میں اس کی پابندی ممکن نہیں تھی ۔اسلئے مختلف اوزان اختیار کئے گئے

آزاد نظم : ۔انگریزی ادب میں شاعری کی جو ہیئت (فری ورس) کہلاتی ہے۔ ہمارے شاعروں نے اسے اپنایا اور آزاد نظم نام رکھا۔ یہ دراصل فرانس کی ایک شعری ہئیت ہے۔اردو میں داخل ہو کر یہ بہت مقبول ہوئی۔ ہمارے جدید شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ اسی شعری ہیئت میں ہیں۔ یہ ہیئت وزن اور قافیہ دونوں پابندیوں سے آزاد ہے۔لیکن ہمارے شاعروں نے اپنی شاعری کا مزاج کو دیکھتے ہوئے کچھ پابندی باقی رکھی ہے۔ہم نے وزن کے معاملے میں یہ رویہ اپنایا کہ کسی ایک رکن مثلاً فاعلن کو کے لیا اور نظم کے تمام مصرعے برابر رکھنے کے بجائے کم زیادہ کر دئے۔

نظم اور غزل میں فرق

نظم شاعری کی وہ شکل ہے جس میں کوئی قصہ' کوئی واقعہ' کوہی تجربہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کیونکہ نظم کے معنی ہی پرونے اور یکجا کرنے کے ہیں۔اس طرح نظم غزل کے بالکل برعکس ہوتی۔غزل کی ہیت یہ ہے کہ تمام مصرعوں کا وزن یکساں ہوتا ہے۔ پہلا شعر جو مطلع کہلاتا ہے اس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔اگر ردیف کا اہتمام کیا گیا ہے تو ردیف بھی ہوتی ہے۔باقی شعروں میں قافیہ ہوتا ہے اور غزل مردف یعنی ردیف رکھنے والی ہے تو ردیف بھی ہوتی ہے۔آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔عاپ طور پر غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکاہی ہوتا ہے اور اپنے ایک معنی دیتا ہے اس کے برخلاف نظم کی کوئی مقرر شکل یا مقرر ہیت نہیں ہوتی اس کیلیے مثلث، مثمن، مربع، مخمس، مسدس وغیرہ فارموں کا استعمال ہوتا ہے۔نظم کیلیے بہر حال ضروری ہے کہ خیال یا معنی کے اعتبار سے اس میں تسلسل ہو اور ایک شعر دوسرے شعر سے پیوست ہوتا چلا جاے۔

اردو نظم کا آغاز و آرتقا

ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے نظم ہمیں سب سے پہلے نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں نظر آتی ہے۔نظیر کی بعض نظمیں اس کی بہترین مثالیں ہے۔مولانا محمد حسین آزاد اور حالی نے نظم کو پائیدار بنیاد اور استحاق بخشا۔زندگی کا ہر واقعہ، ہر واردات و تجربہ ہر رنگ اس کا موضوع ہے۔

جدید اردو شاعری کا آغاز ۱۸۶۵ء میں لاہور میں انجمن پنجاب کے قیام سے ہوتا ہے۔اور جدید اردو نظم کا بھی مشاعروں میں طرحی مصرعوں کی بجایے موضوع اور مختلف موضوعات پر نظمیں تخلیق کرنے کا امتیاز بھی اسی انجمن کو ہے۔اردو شاعری کی بعض بہترین نظمیں انہیں مشاعروں کی دین ہے۔

مولانا حالی، آزاد، چکبست، اقبال اور ظفر علی خان نے اپنی نظموں میں زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو اپنایا۔ان شعرا نے نظم سے بہت کام لیے بقول پرفیسر احتشام حسین:

''بہت سے سویے ہوئے احساس جاگے، دبے ہویے جزبے ابھرے۔دھندلے خیالات روشن ہوئے۔محدود خیالات کی حدیں وسیع ہویں۔موضوعات کے انتخاب کا نظریہ بدلا اور قدیم اور جدید کی آمیزش سے تنوع پیدا ہوا۔''

اس دور کی نظموں میں علامہ اقبال کی نظمیں اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اقبال نے صحیح معنوں میں اردو نظم کو ک بلکل ہی نئے انقلاب سے روشناس کیا۔انہون نے اپنی نظموں میں ان دشوار سوالات کو حل کرنی کی کوشش کی ہے جن کا تعلق تاریخ، عمرانیات، سیاسیات اور روحانیت وغیرہ سے ہے۔علامہ اقبال کے بعد جوش کا نام بھی بہت اہم ہے۔ جوش کی نظم نگاری میں اگرچہ فکر و فلسفے کا پہلو کمزور ہے لیکن رعنائی خیال اور شدت جزبات میں ان کا کوئی

حریف نہیں۔

جوشؔ کی نظموں میں فطرت نگاری کا رجحان پایا جاتا ہے۔انہوں نے انقلاب کا نعرہ لگایا تو دوسری طرف صبح وشام، برسات، چاندنی رات کی کامیاب تصویر کشی کی۔فکر کی گہرائی ان کے یہاں بیشک کم ہے لیکن اندازِ بیان دلکش اور بلند آہنگ ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں ایک پورے عہد کا درد و قرب کھینچ آیا ہے۔ان کی آواز اپنے تمام ہم عصروں سے الگ ہے اور صاف پہچانی جاتی ہے۔

شہریار، ندا فاضلی، راشد آزر، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، وحید اختر، محمد علوی، زاہدہ زیدی، شہنشاہ مرزا، شکیب نیازی، نعیم اشفاق، حمید سہروردی وغیرہ اردو کے دیگر اہم نظم گو شعرا ہیں۔

نظم گو شعرا اور ان کی نظمیں

علامہ اقبالؔ

حالاتِ زندگی: ڈاکٹر اقبالؔ 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ پاکستان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی اور پھر اسکاچ مشن اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کئے۔اقبالؔ بی۔اے اور ایم۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کرنے کے بعد جرمنی چلے گئے جہاں سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے علاوہ بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کر کے لوٹ آئے۔وطن لوٹ کر کچھ وقت وکالت اور پھر مدرسی کرتے رہے۔ بالآخر 61 سال کی عمر پا کر 21 اپریل 1938ء کو انتقال کر گئے اور شاہی مسجد لاہور کے احاطے میں دفن کئے گئے۔

خصوصیاتِ کلام: اقبالؔ نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔مگر اُن کی شہرت ان کی شاعری کی وجہ سے ہوئی۔ان کے کلام میں غزلیں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اقبالؔ بنیادی طور پر ایک نظم گو شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں عمل کا پیام اور خودی کا درس ملتا ہے۔وہ ایک آفاقی شاعر ہیں اور اپنے کلام میں انسانیت و اخوت، حرکت و عمل، اخلاص و اخلاق، عزم و حوصلہ اور محبت و مروّت کا درس دیتے ہیں۔اقبالؔ کا کلام خودی اور عمل کے محور پر ہی گردش کرتا نظر آتا ہے اور وہ ان ہی دو چیزوں پر انسانی زندگی کی بنیادی ترقی اور خوشحالی کی اساس بھی قرار دیتے ہیں۔اسلئے بے عملی کو موت کے برابر سمجھتے ہیں اور خودی کے بغیر انسان کی زندگی ایک حیوان کی زندگی قرار دیتے ہیں۔اقبالؔ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے اور ان کا کلام نایاب جواہر سے لبریز ہے۔جن سے ایک فرد استفادہ کر کے اپنی زندگی کو لاثانی اور انمول بنا سکتا ہے۔اقبالؔ کے اُردو کلام کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو کر قبولیتِ دوام حاصل کر چکے ہیں۔

سوال: نظم ''ایک آرزو'' کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: نظم ''ایک آرزو'' ڈاکٹر اقبالؔ کی نمائندہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔اس نظم میں ان کی شاعرانہ طبیعت میں چھپے ہوئے خلوت نشینی کے شوق کا کھلا اظہار ملتا ہے۔اس نظم میں انہوں نے ہنگامے اور شور شرابے کی دنیا سے اکتاہٹ اور بے زاری کا اظہار کیا ہے۔کیونکہ یہ رزم و بزم کی ہنگامہ آرائیاں اُن کی نازک شاعرانہ طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔وہ چونکہ مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے خاموش پسند تھے اسلئے وہ شور شرابے سے دور خلوت نشینی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میں اس سارے ہنگامے سے دور کسی پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں خاموشی اور سکون کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔دنیا کے لین دین اور اس کے فکر و غم سے دور رہنا چاہتا ہوں اور قدرت کے نظاروں کو قریب سے دیکھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں چڑیوں کی چہچہاہٹ، کلیوں کا کھلنا اور چشموں کا بہنا قریب سے دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں۔میں تنہائی اور خاموشی کی وہ دلکشی چاہتا ہوں جس پر شور شرابے کی محفل کی باقی بچی ہوئی رونق بھی آ کر قربان ہو جائے۔میری تمنا ہے کہ سُریلی آواز والے پرندے میرے دوست بن جائیں اور مجھ سے ذرا بھی خوف نہ کھائیں۔میں پانی، پہاڑ، سبزہ، پھول، سورج اور قدرت کے دوسرے نظاروں کا حُسن

اپنے اصلی انداز میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ راتوں کے بھٹکے ہوئے مسافر جب تھک کر آرام گاہ کی تلاش کرنے لگیں تو میرا ٹوٹا ہوا چراغ اپنی روشنی سے ان کی اُمیدیں بڑھائے۔ آسماں پر چمکتی ہوئی بجلیاں انہیں میرے گھر کا پتہ بتا دیں۔ میں مسجد اور مندر کا احسان اٹھانا نہیں چاہتا۔ اسلیئے خود بخود صبح سویرے کوئل کی کوک کی ہمنوائی چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری جھونپڑی کے روشن دان سے ہی مجھے صبح ہونے کی خبر ملتی رہے۔ رات کے پچھلے پہر جب پھولوں پر شبنم افشانی ہو رہی ہو، میں جاگ کر خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونا چاہتا ہوں اور بے خبر اور غافل لوگوں کیلیئے دعا کرنا چاہتا ہوں تا کہ وہ بھی غفلت کی نیند سے جاگ کر ترقی اور خوشحالی کی راہوں میں آگے رہیں۔

سوال : اس نظم میں علامہ اقبالؔ ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب : نظم ''ایک آرزو'' میں علامہ اقبالؔ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اس دنیا کے ہنگامے اور شور شرابے سے دور رہ کر ہی فطرت کو نزدیک سے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ فطرت کے نظارے بھر پور توجہ چاہتے ہیں۔ ان کی دلکشی اور ان کی خوب صورتی محسوس کرنے کی چیز ہے، جو ایک انسان شور شرابے میں محسوس نہیں کر سکتا۔ قدرت کے نظارے ایک خاص مقصد کیلیئے بنائے گئے ہیں اور یہ ایک انسان کو غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے علامہ اقبالؔ فطرت کی آغوش میں کچھ وقت گزارنے کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔

فیض احمد فیضؔ

حالاتِ زندگی: اس عہد کے لافانی شاعر فیض احمد فیضؔ کی ولادت پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں 13 فروری 1911ء کو ہوئی۔ ان کے والد چودھری سلطان محمد خان علم و فضل میں کمال رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت میں اُنہیں بے حد احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فیض نے انگریزی زبان کے لکچرر کے طور پر اپنے کیرئر کا آغاز کیا۔ لیکن 1943ء میں وہ فوج میں ملازم ہو گئے۔ جہاں پہلے میجر اور بعد میں لفٹیننٹ کرنل بنے۔ 1947ء میں فوج سے مستعفی ہو گئے۔ 1959ء میں پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری ہوئے، اُنہوں نے انگریزی اخبار ''ڈان'' کی ادارت بھی کی اور کچھ عرصہ عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل بھی رہے۔ ترقی پسند شاعروں میں سب سے نمایاں اور سب سے مقبول شاعر فیضؔ ہی ہیں۔ ان کا کلام دنیائے اُردو میں دائمی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہہ سنگ، سر وادیِ سینا اور شام شہر یاراں ان کے لازوال شعری مجموعہ ہیں۔ فیضؔ 20 جون 1984ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے لیکن اُردو شعر و سخن کی دنیا میں فیضؔ کا نام زندہ جاوید رہے گا۔

ان کے کلام کے مجموعات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ نقشِ فریادی (1945) ۲۔ دستِ صبا (1952) ۳۔ زنداں نامہ (1956) ۴۔ دست تہہ سنگ (1964) ۵۔ سر وادیٔ سینا (1971) ۶۔ شام شہرِ یاراں (1974) ۷۔ مرے دل مرے مسافر (1982)

خصوصیاتِ کلام: فیضؔ کالج کے دنوں سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ لاہور کالج کے رسالے ''راوی'' میں ان کی کئی نظمیں شائع ہوئیں ہیں۔ فیضؔ کا ابتدائی کلام رومانی ہے۔ کالج کے دنوں کی رومانی فطرت، جوش، جذبہ اور اُمنگیں ان کے ابتدائی کلام کا پہلا حصہ ہے اور دوسرے حصے میں انقلابی فکر پائی جاتی ہے جو فیض کے انقلابی خیالات کی ترجمان ہے۔ فیضؔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں مگر ان کی غزلیں بھی اعلیٰ معیار رکھتی ہیں۔ انہوں نے غزل کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں استعاروں، تشبیہات اور علامتوں کے سہارے عشق کے سوز و گداز کی ایک حسین دنیا سجاتے ہیں۔ ان کے کام کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ جہاں عشق کا سوز و گداز بھی ہے اور ظلم کے خلاف احتجاج بھی۔ امن کے خوابوں کی تعبیر بھی ہے اور مساوات کی تعلیم بھی۔ فیضؔ کا فکری

انقلاب اوران کی شعوری سوچ ان کی نظموں میں واضح انداز میں سامنے آتی ہے اور قاری کے ذہن و دل کو جھنجوڑ کے رکھ چھوڑتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے فیضؔ بہت متاثر ہوئے۔ یہ تحریک خطابیہ شاعری کا مطالعہ کرتی تھی۔ انہوں نے بھی کئی نظمیں جیسے سیا ''سی لیڈر کے نام''، ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے''، ''ایرانی طلبہ کے نام'' اور ''زرد پتے'' کہہ کر اس تحریک کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی۔ ان کی کچھ نظمیں محض پروپیگنڈہ کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں ''رقیب سے''، ''مرے ہمدم میرے دوست'' اور ''شیشوں کا مسیحا'' وغیرہ جیسی نظمیں شامل ہیں۔ مگر فیضؔ ایک سچے شاعر تھے اور زیادہ دیر تک وہ اپنے اصلی رنگ کو دبا کے نہ رکھ سکے۔ انہوں نے اشارے کنائے اور علامتوں وغیرہ کا استعمال کر کے ''ہم لوگ''، ''تنہائی''، ''صبحِ آزادی'' اور ''دریچہ'' جیسی کامیاب اور لافانی نظمیں لکھ کر اُردو ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔

جوش ملیح آبادی

حالاتِ زندگی: جوشؔ ملیح آبادی کا اصل نام شبیر حسن خاں ہے۔ پہلے شبیرؔ تخلص کرتے تھے بعد میں جوشؔ اختیار کیا۔ 1894ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ جوشؔ کی ابتدائی تعلیم سیتا پور، لکھنو، علی گڑھ اور آگرے میں ہوئی۔ مگر والد کی وفات کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ 1920ء میں انہیں ڈاکٹر اقبالؔ اور سر کشن پرشاد شادؔ کی سفارش کی وجہ سے حیدر آباد کے ''دارلترجمہ'' میں ''ناظرِ ادب'' کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ 1934ء میں انہوں نے شمالی ہندوستان کا رُخ کیا اور یہاں دہلی میں رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ شاعری کا آغاز انہوں نے ملیح آباد میں ہی کیا تھا اور عزیزؔ لکھنوی سے چھ سال تک اصلاح لیتے رہے تھے۔ دہلی آکر ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی اور انہوں نے باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کیا۔ ان کی طبیعت شاعری کے لئے بڑی موزون تھی اور اس پر ان کے گہرے مطالعے نے بھی ان کے شعری ذوق کو بڑھاوا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا شمار اُردو کے قادر الکلام شاعروں میں کیا جانے لگا۔ جوشؔ سرکاری ادبی رسالہ ''آج کل'' کے مُدیر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو میں بھی کچھ عرصہ کام کیا ہے۔ 1957ء میں انہوں نے پاکستان کی شہرت حاصل کر لی اور وہیں 1982ء میں ان کا انتقال ہوا۔

خصوصیاتِ کلام: جوشؔ نے غزلیں بھی لکھی ہیں مگر ان کی شاعری کا بیشتر سرمایہ ان کی نظموں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے تحریکِ آزادی کی حمایت میں جو نظمیں لکھیں وہ ان کی شہرت کا باعث بنیں اور ان کو ''شاعرِ اانقلاب'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ مناظرِ فطرت جوش کیلئے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسلئے ان کو ''شاعرِ فطرت'' بھی کہا جاتا ہے۔ جوشؔ ایک فطری شاعر تھے۔ ان کے کلام میں نگارستانِ فطرت کی عکس بندی، عشق کے آتش کدے کا دیدار، زلفوں کی گرفتاری، وطن کی محبت کے جذبات، شباب کی رنگینیاں، مفلسوں کے دلوں کی دھڑکنیں غرض تمام اجزاء کی موجودگی ہے۔ جوشؔ کی کامیاب ترین نظموں میں ''ساون کا مہینہ''، ''برسات کی چاندنی''، ''موجِ باراں''، ''برسات کی شفق''، ''پہلی گھٹا''، ''بہار کی دوپہر''، ''بھیگی رات''، ''برسات کی شام''، ''بہار کا ترانہ''، ''شام کی بزم آرائیاں''، ''البیلی صبح''، ''بدلی کا چاند'' اور نغمۂ سحر'' وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ جوشؔ نثر و نظم میں جو شہکار اپنے پیچھے چھوڑے ان میں ''روحِ ادب''، فکر و نشاط''، ''نقش و نگار''، ''شعلہ و شبنم''، ''سُنبل وسلاسل''، عرش وفرش''، ''سرود و خروش''، ''حرف و حکایت''، ''سموم وصبا''، ''رامش و رنگ''، ''آیات و نغمات''، ''سیف و سبو''، ''طلوعِ فکر''، ''موجد و مفکر''، ''جنوں و حکمت''، الہام و افکار''، نجوم و جواہر، حرفِ آخر اور ''یادوں کی بارات'' وغیرہ شامل ہیں۔

سوال: نظم ''حُسن اور مزدوری'' کا خلاصہ لکھئے اور حُسن اور مزدوری کے تصور کو واضح کیجئے۔

جواب: نظم ''حُسن اور مزدوری''، جوشؔ ملیح آبادی کی ایک شہکار نظم ہے۔ یہ نظم ان کی رومانی اور انقلابی فکر کا پتہ دیتی ہے۔ ایک خوبصورت نوجوان مزدور لڑکی کی تصویر پیش کرتے ہوئے جوشؔ بہت متاثر کرنے والے انداز میں اس کی مجبوریوں کا احساس دلاتے ہیں۔ اس نظم میں اس لڑکی کے حُسن و جمال کے دلفریب نقوش اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہوئے جہاں ایک طرف پڑھنے والے کو زبان و بیان پر اپنی قدرت کا احساس دلاتے ہیں وہیں دوسری طرف اس کی مجبوری کا ذکر کر کے اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایک مزدور لڑکی جو اپنی غریبی کے ہاتھوں مجبور ہو کر جھلسا دینے والی دھوپ میں

سڑک پر کنکر توڑتی ہے۔ کنکر توڑتے وقت اس کی چوڑیاں بجتی ہیں۔ جن کی صداؤں میں اس کے تڑپتے ہوئے ارمانوں کی آواز دب کر گُم ہو جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئیں اور زلفیں گرد و غبار سے آلودہ ہیں۔ اس کے سر پر آگ برساتا ہوا سورج اس کی خوب صورتی کو خاک میں ملا رہا ہے۔ اس کے رخسار دو مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح ہیں۔ اور اس کے ہونٹ مُسکراہٹ کو ترستے ہیں۔ اس لڑکی کا دل غم کا مارا ہوا ہے اور اس کی گردن غم کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر شاعر کا دل رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شاعر ان نازک اور خوب صورت ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ نرم و نازک ہاتھ قدرت نے پتھر توڑنے جیسے سخت کام کے لئے نہیں بنائے ہیں۔ شاعر اس لڑکی کی خوب صورت آنکھوں میں آنسوؤں کے بدلے مُستقبل کے خوب صورت خواب دیکھنا چاہتا ہے اور ان خُشک ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ اس خوب صورت اور نازک سی لڑکی کے ہاتھ اب غربت اور مجبوری کی زنجیروں سے آزاد کئے جانے چاہیے اور اس کی ان نازک سی کلائیوں میں ایک خوب صورت ہلکا سا کنگن پہنا جانا چاہیے۔ کیونکہ عورت صنفِ نازک ہے۔ اس سے ایسے سخت کام لینا سراسر ناانصافی کی بات ہے۔

جوش نے حُسن اور مزدوری کے تصور کو استعارے کے بطور استعمال کیا ہے۔ حُسن انہوں نے کم عمر بچوں اور جوانوں کے لئے بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اور مزدوری وہ حالات ہیں جن کے ہاتھوں کم عمر بچوں نے اپنا بچپن کھویا ہے اور جوانوں کی جوانی جس کی نذر ہو کر رہ گئی ہے۔ اس استعارہ کے پیچھے ہندوستانی سماج کی تلخ مگر ناقابلِ فراموش حقیقت موجود ہے۔ ہندوستان میں ایسے افراد کی تعداد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہے جو بچپن میں ہی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مزدوری کرنے لگتے ہیں۔ یہ بدنصیب بچے ہو کر بچپن سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہنسنے کھیلنے کے دن غربت اور مزدوری کے ہاتھوں ہمیشہ کیلئے چھن جاتے ہیں۔ ایسے ہی ان جوانوں کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے جو جوانی کی خوشیوں اور بے فکری سے بے خبر رہتے ہیں۔ کم عمری میں ہی ایسے افراد کی گردنیں غربت کی زنجیر کے بوجھ سے دب جاتی ہیں۔ زندگی کے تین مختلف مراحل یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا ان افراد کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ان کیلئے زندگی کا بس ایک نام ہوتا ہے یعنی سزائے بے گُناہی۔

علی سردار جعفری

حالاتِ زندگی: علی سردار جعفری ترقی پسند شاعروں کی صف اول سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلرام پور ضلع گونڈہ اتر پردیش میں 1913ء میں پیدا ہوئے۔ ایک عرصے تک لکھنو میں مقیم رہے۔ تعلیم لکھنو، دہلی اور علی گڑھ میں پائی۔ شروع ہی سے ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے۔ لکھنو سے مجاز اور سبطِ حسن کے تعاون سے ایک رسالہ ''نیا ادب'' نکالا۔ بعد میں ممبئی چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ آپ کا انتقال 2000ء میں ہوا۔

خصوصیاتِ کلام: سردار جعفری نے شروع میں کچھ طویل نظمیں شائع کیں۔ ''نئی دنیا کو سلام'' طویل مثنوی ہے جس میں شہنشاہیت کے خاتمے کا اعلان ہے۔ ''خون کی لکیر''، ''ایشیا جاگ اُٹھا''، ''امن کا ستارہ'' اور ''پتھر کی دیوار'' میں بھی انسان دوستی کے جذبات ہیں۔ ساتھ میں قومی اور بین الاقوامی شعور کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ''ایک خواب''، ''پیراہنِ شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' ان کی دوسری شعری تصانیف ہیں۔ ''ترقی پسند ادب'' نام پر بھی کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ دیوانِ غالبؔ، میرؔ اور کبیرؔ بانی کو بھی اپنے تعارفی مقدموں کے ساتھ اُردو اور دیوناگری میں شامل کیا۔ رسالہ ''گفتگو'' بھی کئی برس تک ان کی ادارت میں ممبئی سے نکلتا رہا۔ سردار جعفری نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ ترقی پسند فکر کو اُردو شاعری میں جن شعراء نے پروان چڑھایا ان میں سردار جعفری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ طبقاتی کشمکش، معاشی اور سماجی نابرابری اور سیاسی استحصال کے خلاف وہ شروع ہی سے قلمی جنگ کرتے رہے۔ انسان دوستی، محبت، امن و آشتی اور سماجی مساوات ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی دسترس ہے۔ پیکروں، تشبیہات و استعارات کا استعمال ان کے یہاں خوب ہے۔ بعض شعری تخلیقات یقیناً ایسی ہیں جن میں ترقی پسندی ایک نعرہ بن گئی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر وہ منجھے ہوئے شاعر تھے اور اُردو کی شعری روایت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔

خلاصہ:۔

اس اکائی میں پہلے نظم کی صنفی شناخت کو واضح کیا گیا اور بتایا گیا کہ نظم کی کوئی مخصوص شکل وصورت نہیں ہوتی اور اس کے اندر فکر وخیال کا تسلسل اور اشعار میں آپسی ربط ضروری ہے اس کے بعد نظم اور غزل کے مابین فرق کو بھی سمجھایا گیا اور اس بات کی وضاحت کی گئی کہ کس قدر نظم غزل سے ایک مختلف صنفِ سخن ہے۔اسکے علاوہ اردو نظم کے مختلف ادوار کو موضوع بحث بنایا گیا جس میں انجمنِ پنجاب اور مختلف نظم گوشعرا کی تاریخی اہمیت کا خصوصی تذکرہ کیا گیا آخر میں کچھ نصابی نظموں کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا۔ مطالعہ کی جانچ کیلئے سوالات بھی دیئے گئے ہین اور مشکل الفاظ کے معنی بھی فرہنگ میں پیش کئے گئے۔مطالعاتی مواد کو تیار کرنے کے دوران جن ماخذات سے مدد لی گئی ہے اُن کا حوالہ بھی نیچے دیا گیا ہے۔

جانچ

۱۔ کیا نظم میں تسلسل اور ربط لازمی ہے؟

۲۔ نظم کی پانچ شکلوں کے نام لکھیئے

۳۔ مثلث اور مثمن کسے کہتے ہیں؟

۴۔ مستزاد نظم کی کون سی فارم ہے؟

۵۔ نظم معرا کسے کہتے ہیں؟

۶۔ نظم کے دس شاعروں کے نام لکھیے؟

۷۔ دس شاہکار نظموں کے نام لکھیے۔

۸۔ انجمنِ پنجاب کب قائم ہوئی؟

۹۔ حالی کس دور کے شاعر تھے؟

کتابیات

۱۔	تاریخ ادب اردو	پروفیسر نورالحسن نقوی
۲۔	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سنبل نگار
۳۔	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتحپوری
۵۔	نظم اور معریٰ نظم	شاہ فیصل

اردو قصیدہ : تعارف اور صنفی خصوصیات

تمہید

قصیدہ ایک شاندار صنفِ سخن ہے اور اس کا ماضی بہت تابناک رہا ہے۔قصیدہ بالارادہ لکھی جانے والی شاعری ہے۔قصیدہ ایسی صنف سخن کو کہا جاتا ہے جو کسی کی تعریف میں بالارادہ لکھی جائے۔قصیدہ میں پرشکوہ الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔مبالغہ قصیدے کا لازمی جز قرار دیا جاتا ہے۔قصیدہ نگاری کی ابتداء عربی زبان میں ہوئی۔اہلِ عرب عکاظ کے میلہ میں جمع ہوتے اوعرا اپنے لکھے ہوئے قصائد سناتے۔ان قصیدوں میں سے سات قصائد کو چن کر کعبہ شریف کی دیوار پر چسپاں کیا جاتا تھا۔قصیدے کو شاہی اور جاگیر شاہی نظام کی دین تصور کیا جاتا ہے۔شعراء نے بادشاہوں کی شان میں قصیدے لکھے جس کا

مقصد حصول انعام واکرام رہا۔ بادشاہ، نواب، نواب زادے اور جاگیردار حضرات نے ان شعراء کی مالی امداد کے لئے نہ صرف وظائف مقرر کئے بلکہ مختلف انداز میں شعراء کو نوازا۔ اس طرح شاعری میں قصیدہ کو عروج حاصل ہوا۔ غزل جیسی دلفریب صنفِ سخن نے قصیدے کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے۔

مقاصد

اس اکائی میں قصیدے کی اہمیت، افادیت، تعریف، فن، خصوصیت، اجزاء اور آغاز وارتقا سے واقف کرایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ذوقؔ اور سوداؔ کی قصیدہ نگاری کا جائزہ بھی پیش کیا جائے گا۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ قصیدے کی تعریف اور اس کے فن کو سمجھ سکیں۔

☆ قصیدے کی تاریخ سے واقف کرا سکیں۔

☆ شیخ ابراہم ذوقؔ دہلوی اور مرزا محمد رفیع سودا کا مختصر تعارف کرا سکیں۔

☆ شیخ محمد ابراہم ذوقؔ دہلوی اور سوداؔ کے کلام کی خصوصیات بیان کر سکیں۔

آموزشی ماحصل

۱۔ طلباء شعری اصناف کی پہچان رکھتے ہیں۔

۳۔ طلباء قصیدے پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

۴۔ طلباء قصیدے کی تعریف اور تاریخ جانتے ہیں۔

۵۔ طلباء اُردو کے اہم قصیدہ نگاروں کی جانکاری رکھتے ہیں۔

۲۔ طلباء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات اور ادبی کارناموں کی جانکاری رکھتے ہیں۔

قصیدہ کی تعریف اور اس کا فن

لفظ قصیدہ عربی زبان کے لفظ ''قصد'' سے نکلا ہے۔ قصیدہ دراصل اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی تمام اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوں لیکن ردیف کی پابندی ضروری نہیں۔ قصیدہ نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی کی تعریفیں یا برائی بیان کی جائے۔ مگر شاعروں نے اس میں اور بھی مضامین بیان کیے ہیں۔ قصیدے اکثر بادشاہوں کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔ کسی واقعے کی یادگار کے طور پر بھی قصیدہ لکھا جاسکتا ہے۔ غزل کی طرح قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسے مطلع کہتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں لیکن کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ آٹھ سو اشعار کے قصیدے دستیاب ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے قصیدے کا کوئی عنوان بھی ہوتا ہے جیسے غالبؔ کے قصیدے کا عنوان ''درمدح بہادر شاہ ظفر'' ہے

قصیدے کو مضمون کے اعتبار سے چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مدحیہ، ہجویہ، وعظیہ، بیانیہ

مدحیہ: جس قصیدے میں کسی کی مدح یعنی تعریف کی جائے وہ مدحیہ کہلاتا ہے۔

ہجویہ: جس قصیدے میں کسی شخص کی برائی بیان کی گئی ہو یا زمانے کی خرابی کا گلہ ہو، ہجویہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

وعظیہ: جس قصیدے میں وعظ ونصیحت جیسے مضامین پائے جائیں وہ وعظیہ قصیدہ ہے۔

بیانیہ: وہ قصیدہ ہے جس میں مختلف حالات وکیفیات کا بیان ہو جیسے بہار کا تذکرہ، زمانے کے حالات ومصائب کا گلہ جیسے شہر آشوب

قصیدہ کی خصوصیت

قصیدہ واحد صنف ہے جس میں اظہار و بیان کے تمام اسالیب اور جہتیں سمٹ آئی ہیں۔ جن ہستیوں کی شان میں قصیدے کہے جاتے تھے وہ صاحبانِ جاہ وجلال، پُر رعب اور باوقار ہوتے تھے اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ جس زبان میں ان سے خطاب کیا جائے وہ بھی پُر شکوہ اور زوردار ہو۔ اس لیے یہ شرط لازمی ٹھہری کہ قصیدے کی زبان زوردار، لہجہ پُر وقار اور الفاظ رعب دار ہوں۔ استعارہ وتشبیہ کی کثرت ہو اور ان میں ندرت وطرفگی پائی جائے۔ قافیے مشکل اور زمین سنگلاخ ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ قصیدوں میں صنائع وبدائع کا بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے اور علمی اصطلاحات کا استعمال بھی پسندیدہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ قصیدے کا یہ مقصد رہا کہ شاعر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر کے ممدوح اور سامعین کو مرعوب ومتاثر کرے تاکہ ممدوح انعام واکرام اور سامعین داد وتحسین پر آمادہ ہوں۔

قصیدہ کے اجزائے ترکیبی

بناوٹ کے لحاظ سے قصیدے کی دو قسمیں ہیں۔ خطابیہ اور تمہیدیہ

خطابیہ قصیدہ تعریف یا برائی سے شروع ہوتا ہے جبکہ تمہیدیہ قصیدہ میں تعریف یا برائی سے پہلے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ تمہیدیہ قصیدہ کے چار حصے ہوتے ہیں۔ (۱) تشبیب (۲) گریز (۳) مدح یا ہجو (۴) مقطع یا خاتمہ

(۱) تشبیب: تمہیدیہ قصیدے کے شروع میں کچھ اشعار بہار، حسن وعشق وغیرہ کی تعریف میں لکھے جاتے ہیں اس حصے کو تشبیب کہتے ہیں۔ مثلاً

صبحِ دم دروازۂ خاور کھلا مہر عالم تاب کا منظر کھلا

(۲) گریز: تمہید اور مدح کے درمیان جو اشعار لکھے جاتے ہیں اُنہیں گریز کہتے ہیں۔ مثلاً

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ کعبۂ امن واماں کا در کھلا

(۳) مدح یا ہجو: یہ قصیدے کا اصل موضوع ہے اس حصے میں شاعر حد سے زیادہ تعریفیں یا برائی بیان کرتا ہے۔ مثلاً

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا

(٤) مقطع یا خاتمہ: اس حصے میں شاعر اپنے ممدوح کی سلامتی اور لمبی عمر کی دعا کرتا ہے اور کبھی کبھی اپنی خواہش بھی بیان کرتا ہے۔ مثلاً

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ تا نہ ہو زندگی دشوار

قصیدہ کی تاریخ

قصیدے نے سرزمین عرب میں جنم لیا اور وہاں بے حد مقبول ہوا لیکن قدیم شعرائے عرب نے قصیدہ گوئی کو جھوٹی خوشامد اور کار برآری یعنی اپنا کام نکالنے اور انعام پانے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ عرب شعراء قصیدے میں اپنے قبیلے، اپنے گاؤں، کسی بزرگ یا اپنے محبوب کی تعریف بغیر کسی غرض کے صدق دل سے کرتے تھے۔ اس وقت قصیدے میں جھوٹ اور مبالغے کا بھی گزر نہ تھا۔ اس لیے قصیدہ نگار جو کچھ لکھتا تھا، سننے اور پڑھنے والے اس پر یقین کرتے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ صورت نہ رہی اور شاعر اسے حصولِ مطلب کے لیے استعمال کرنے لگے۔

عرب سے یہ صنف ایران پہنچی۔ وہاں کی مخصوص تہذیب نے اسے متاثر کیا۔ نتیجہ یہ کہ قصیدے میں تصنّع، بناوٹ، مبالغہ آرائی اور جھوٹ کا دور دورہ ہو گیا۔ فارسی کے بلند پایہ شاعروں نے قصیدے کی طرف توجہ کی اور اسے بہت فروغ دیا۔ لیکن قصیدہ اب مصلحت کا شکار ہو چکا تھا اور اسے کام نکالنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔

اردو میں قصیدہ نگاری کی شروعات دکن سے ہوئی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۱۶۱۱ء کے قریب قصیدے لکھے۔ ان قصائد کی زبان کو دکنی اردو کہنا بجا ہے۔ کیونکہ ان میں دکنی الفاظ کی کثرت ہے۔ دکن کے قصیدہ گو شعراء میں نصرتی کا نام بھی اہم ہے۔ اس کے بعد شمالی ہند میں سوداؔ نے قصیدہ گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس صنف سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ انہوں نے مدحیہ اور ہجویہ قصائد بھی لکھے اور شہرآشوب بھی کہے۔ قصیدہ نگاری کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں مثلاً زورِ بیان، شوکتِ الفاظ، مضمون آفرینی نیز پرکشش تشبیب، دلچسپ گریز، پرجوش اور مبالغہ آمیز مدح وہ سب سوداؔ کے قصیدوں میں موجود ہے۔

لکھنو میں مصحفیؔ وانشاءؔ نے بھی بہت سے قصیدے لکھے لیکن عہد سوداؔ کے بعد قصیدہ نگاری کا دوسرا اہم دور مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کا عہد ہے۔ مومنؔ کسی دربار سے وابستہ نہ تھے نہ انعام کے طلبگار تھے لیکن اظہارِ تشکر کے طور پر انہوں نے بھی قصیدے کہے۔ غالبؔ نے کئی قصیدے لکھے اور اس میدان میں بھی اپنا رستہ سب سے الگ نکالا۔ قصیدہ نگاری میں ان کی توجہ مدح سے زیادہ تشبیب پر رہتی ہے۔ غالب کے قصیدے اپنا انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ لیکن اس عہد کے سب سے اہم قصیدہ گو ذوقؔ ہیں۔ ان کے قصیدے گہرا علمی رنگ لیے ہوئے ہیں اور ان میں اصطلاحات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی لکھنو اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ مرثیہ گوئی میں انہیں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ نعتیہ قصیدہ گوئی میں محسنؔ کاکوروی نے قابل رشک مقام حاصل کیا۔ قصیدے اس کے بعد بھی کہے گئے لیکن پھر کوئی ایسا قصیدہ نگار پیدا نہیں ہوا جس کا نام قابلِ ذکر ہو۔

قصیدہ ''در مدح بہادر شاہ ظفر''

تمہید

قصیدہ نگاری اُردو شاعری کی ایسی ایک مستقل صنف سخن ہے جو سخت اور پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر ایک قصیدہ گو کی کمال مہارت، جولانیٔ طبع، حسین مرصع کاری اور پرجوش صنعتوں کا کیسا استعمال ہوا ہے، واضح کرتی ہے۔ ان اوصاف بالا میں جو شاعر کمال ہنر اور مکمل دسترس رکھے گا وہی ایک کامیاب قصیدہ گو اور قصیدہ گوئی کا بے تاج بادشاہ کہلائے گا کیونکہ یہی جدت بیانی، سلاست الفاظ، نغمگی اور موسیقیت کا صحیح اور بروقت استعمال شاعر کو بلندی پر لے جاتا ہے اور یہی اوصاف بالا شاعر کی شعر گوئی، ذوق اور شعر فہمی میں سخت گرفت کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی کی قصیدہ نگاری میں کچھ ایسی ہی حیثیت پائی جاتی ہے جس نے ذوقؔ کو اس بلندی پر لا کھڑا کیا جب کہ ان سے پہلے سودا اس میدان کے بے تاج بادشاہ رہ چکے ہیں۔ قصیدہ نگاری سے ذوق کا نام چسپاں ہے اگر ذوق کو قصیدہ سے قصیدہ کو ذوق سے علیحدہ کر دیا جائے تو یہ فن خزاں کی طرح ویران نظر آئے گا۔ ذوق اُنیس سال کے تھے اسی وقت سے وہ ایک مستند قصیدہ گو شمار کئے جاتے تھے۔ آیئے! اب ہم شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی کے حالاتِ زندگی، ادبی کارنامے اور خصیوصیات کلام کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

شاعر کا تعارف

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی پیدائش 1789ء میں دہلی میں ہوئی۔ وہ ایک فوجی کے فرزند تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول کی درسگاہ میں ہوئی۔ حافظ صاحب ایک شاعر بھی تھے۔ ذوقؔ ان کے ساتھ مشاعروں میں جایا کرتے تھے جہاں کی ادبی فضا نے ذوقؔ کی طبیعت پر خاصہ اثر ڈالا۔ رفتہ رفتہ ذوقؔ کے اندر بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اپنا ابتدائی کلام حافظ صاحب کو ہی دکھاتے رہے پھر شاہ نصیر کی شاگردی قبول کی۔ شاہ نصیر نے اپنے شاگرد کے کمال کو دیکھا تو وہ ان سے جلنے لگے اور بے وجہ ان کو ستانے لگے۔ آخر ذوقؔ نے تنگ آ کر شاگردی کا یہ رشتہ توڑ دیا اور اپنے کلام پر خود ہی اصلاح دینے لگے۔ ذوقؔ اب شعر گوئی پر کافی محنت کرنے لگے اور مشاعروں میں باضابطہ شرکت کرنے لگے۔ مرزا ابومظفر ان دنوں ولی عہد تھے۔ ذوقؔ ان کے مشاعروں میں

برابر شریک ہوتے رہتے تھے اور صرف بیس سال کی عمر میں ان کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ مرزا ابوالمظفر جب بہادر شاہ ہوکر بادشاہ بنے تو اپنے استاد کا بھی خاص خیال رکھنے لگے اور انہیں اپنے دربار میں ملک الشعراء کا عہدہ دے دیا۔ بادشاہ کے استاد ہونے کی وجہ سے ذوقؔ کی کافی عزت افزائی ہوئی اور اس پر ان کی خداداد صلاحیت اور ریاضت نے سونے پہ سُہاگے کا کام کیا۔ ذوقؔ ادب کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارے کی حیثیت سے چمکتے رہے۔ ذوقؔ ایک نرم مزاج اور شریف طبیعت کے انسان تھے۔ بڑی سیدھی سادی زندگی بسر کی۔ ان کا انتقال 1854ء میں ہوا۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوقؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات

ذوقؔ نے اپنی زندگی کے پچاس سال شعر گوئی میں صرف کئے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا مگر ان کا بہت کلام غدر کے لوٹ مار کے دوران ضائع ہوگیا۔ غزل اور قصیدہ ان کی پسندیدہ اصناف رہی ہیں۔ انہوں نے مخمس، رباعیات، تاریخیں اور گیت وغیرہ بھی کافی لکھے ہیں۔ مگر ان کی خاص شہرت کا باعث ان کے قصیدے ہیں۔ ان کی جوانی کے دنوں کے قصیدے اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں لکھے گئے ہیں اور بعد کے تمام قصیدے بہادر شاہ ظفر کی ستائش میں لکھے گئے ہیں۔ دہلی کے باہر کا کوئی بھی بادشاہ یا نواب ذوق کے قصیدے کا ممدوح نظر نہیں آتا ہے۔ زمانے کے ہاتھوں سے جو قصیدے بُرباد ہونے سے بچ گئے ان کی تعداد پچیس (۲۵) ہے۔ ان کے ابتدائی قصیدے تکلف اور مبالغہ آمیزی سے بہت حد تک پاک نظر آتے ہیں۔ ان میں شگفتگی اور روانی زیادہ پائی جاتی ہے۔ ذوقؔ چونکہ بہت سارے علوم اور فنون پر قدرت رکھتے تھے۔ اسلئے ان کے بعد کے قصائد میں ان علوم وفنون مثلاً منطق، فلسفہ، عقائد، طب، حکمت، نجوم، صرف ونحو، علم معانی، علم البیان، حدیث اور فقہ وغیرہ کی اصطلاحات بھی آگئی ہیں۔ یہ قصیدے اس وجہ سے ایک طرح کا بوجھل پن اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ذوقؔ کا ایک ایسا قصیدہ جس پر انہیں بہادر شاہ ظفرؔ کی طرف سے ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا۔ اٹھارہ شعروں پر مشتمل ہے اور ہندوستان کی اٹھارہ زبانوں میں ایک ایک شعر لکھا گیا ہے۔ ذوقؔ کے قصائد کی زبان صاف ہے۔ وہ الفاظ کا مناسب اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں تشبیہات و استعارات اور محاورات وضرب الامثال کی بھی کثرت پائی جاتی ہے جو ان کے زبان و بیان پر قدرت رکھنے کی کھلی دلیل ہے۔ اُردو قصیدے کی تاریخ میں ذوقؔ کا درجہ سوداؔ کے بعد سب سے بڑا ہے۔

خلاصہ

شیخ محمد ابراہیم بہادر شاہ ظفر کے استاد اور درباری شاعر تھے۔ یہ ان کے دربار میں ملک الشعراء کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے کچھ قصیدے اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ہیں۔ مگر زیادہ تر قصیدے بہادر شاہ ظفر کی ستائش میں لکھے ہیں۔ یہ قصیدہ بھی اسی ذیل میں لکھا گیا ہے۔ اس قصیدے میں ذوقؔ کہتے ہیں کہ اب کے برس موسمِ برسات میں عید آئی ہے یہ شراب بنانے والے کی قسمت پر بن آئی ہے۔ کیونکہ موسم برسات میں مے کشی بھرپور کی جاتی ہے اور اس پر عید کی خوشیاں۔ پینے والے خوب پیئیں گے۔ ماہِ شوال کا چاند آسمان پر اشارہ کررہا ہے کہ کل عید ہے اور موسم برسات چل رہا ہے اس لئے یہ دوگنی خوشی کا موقع ہے اور مے کشی کا دور اب کے خوب چلنا چاہیے۔ ذوقؔ کہتے ہیں کہ سُرخ مے صاف وشفاف پیمانوں میں بھری ہوئی ہے اور مے کش کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ آج بجلی آسمان پر چمکتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مے کا نشہ تیز ہوکر آگ لگا گیا ہو۔ برسات کھل کر ہوگئی اور سب کچھ پانی میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں دریا معلوم ہوتی ہیں اور تالاب سمندر سے زیادہ جوش مارنے لگے ہیں۔ برسات کے زور سے سردی فضاؤں میں بڑھ گئی۔ سب برسات کے موسم کا لطف لینے لگے ہیں۔ مدرسہ کے بچے پڑھائی کے بدلے برسات کا لطف لینے میں خوش ہیں۔ چمن کی خوب صورتی ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ ہر پھول پر آج حد سے زیادہ نکھار آیا ہوا ہے اور ہر پھول خوشی میں سرمست نظر آرہا ہے۔ گانے والے نے کچھ ایسا گیت چھیڑا ہے کہ آج کانٹوں

کی زبان پر بھی خوشی سے شعر آرہے ہیں۔ چمن کی دیواروں پر بنی تصویروں میں بھی جان پڑ گئی اور ہر پرندے کی تصویر نغمہ گانے لگی ہے۔ ذوقؔ بہادر شاہ ظفر کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ کا علم اتنا وسیع ہے کہ آسمان کے سینے میں بھی نہیں سما سکتا۔ آپ اپنے سونے کے تخت پر اس طرح جلوہ افروز ہیں جس طرح رحل پر قرآن ہو۔

<u>قصیدہ ''در ھجو اسپ المسمّیٰ بہ تضحیکِ روزگار''</u>

تمہید

قصیدہ ''در ہجو اسپ المسمّیٰ بہ تضحیکِ روزگار'' سوداؔ کا ایک نہایت ہی مشہور ہجویہ قصیدہ ہے۔ سوداؔ نے دیگر اصنافِ شعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن قصیدہ نگاری کے میدان میں ان کا مدِ مقابل بہت مشکل سے ملے گا۔ جہاں تک ''ہجویہ قصیدہ'' کا تعلق ہے سوداؔ نہ صرف اُردو کے سب سے بڑے ہجو نگار شاعر ہیں بلکہ فارسی میں بھی ان کے مرتبہ کا شاعر نہیں ہوا ہے۔

اس اکائی میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کا تعارف، خصوصیاتِ کلام اور ''قصیدہ در ہجو اسپ المسمّیٰ بہ تضحیکِ روزگار'' کی وضاحت پیش کیا گیا ہے۔

شاعر کا تعارف:

مرزا محمد رفیع سوداؔ کے والد محمد شفیع تجارت کی غرض سے کابل سے دہلی آئے۔ یہیں محمد رفیع سوداؔ 1713ء میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شاہ حاتم کے شاگرد رہے۔ مزاج کے اعتبار سے بےفکرے تھے۔ سوداگری آبائی پیشہ تھا مگر یہ ان کے بس کا نہ تھا۔ کچھ وقت تک فوج میں ملازمت کرلی۔ والد کے پیشے (سوداگری) کی نسبت سے سودا تخلص اختیار کیا تھا۔ سوداؔ مختلف امرا سے وابستہ رہے۔ جن میں محمد شاہ، خواجہ سرا بسنت علی خاں، سیف الدولہ احمد علی خان، نواب غازی الدین خان، عمادالملک، مہربان خاں رندؔ، نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ اہم ہیں۔ سوداؔ نے 1781ء کو لکھنو میں انتقال فرمایا۔

سوداؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات:

سوداؔ نے شاعری کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، رباعیاں، مستزاد، قطعات، تاریخیں، پہیلیاں، واسوخت اور شہر آشوب سب کچھ کہا، لیکن ان کے زورِ بیان کے جوہر قصیدہ گوئی میں کھلتے ہیں اور قصیدہ گوئی میں ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اُن کے قصائد شوکتِ الفاظ، تازگئ مضامین، بُلند خیالی، بندش کی چستی اور جدّتِ تراکیب کی وجہ سے فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

سوداؔ زمین منتخب کرتے ہیں لیکن نشست الفاظ سے دلآویز بنا دیتے ہیں۔

قصیدے کی شان پوری طرح قائم رکھتے ہیں یعنی متانت، پختگی، زورِ الفاظ، مضمون آفرینی، عُلُوِ تخیل جتنا ان کے قصائد میں ہے وہ اور کسی کے یہاں نہیں ملتا۔

استعارے اور تشبیہات کے صَرف میں جدت وندرت سے کام لیتے ہیں۔

سوداؔ کے قصائد میں محاکاتی شاعری نہایت خوبی کے ساتھ موجود ہے۔ جو اُردو کے دوسرے قصیدے کہنے والوں کو بہت کم نصیب ہوئی۔

سوداؔ کے قصائد میں مدح اور ہجو کے علاوہ تاریخی واقعات بھی ہیں۔

سوداؔ کی جدت پسند طبیعت نے بہاریہ تمہید کو پامال سمجھ کر نئے عنوان بھی پیش کیے ہیں۔

قصیدے کا خلاصہ:

قصیدہ ''تضحیکِ روزگار'' جس کا پورا نام ''در ہجو اسپ المسمیٰ بہ تضحیکِ روزگار'' ہے۔ یہ سوؔدا کا ایک عمدہ قصیدہ ہے۔ اس میں اُنہوں نے ایک گھوڑے کی ہجو یعنی برائی بیان کی ہے۔ یہ قصیدہ معنوی اعتبار سے ''قصیدہ ہجویہ'' کہلاتا ہے۔ اس قصیدے میں اُنہوں نے گھوڑے کی کمزوری اور ناطاقتی انتہائی مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کی ہے۔

اس قصیدہ میں سوؔدا نے ''گھوڑے'' کو حکومت اور فوج کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اپنے عہد کی معاشی بدحالی، حکومت کی بدانتظامی اور فوج کی حالتِ زار پر طنز کیا ہے۔ اس موضوع کو سوؔدا نے ڈرامائی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے ایک دوست تھے۔ جن کے طبیلے میں کسی وقت عراقی اور عربی گھوڑوں کا شمار نہ تھا۔ اب یہ حال ہے کہ ان کے ہاں صرف ایک نیم مردہ گھوڑا باقی رہ گیا ہے۔ وہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں اس کے باوجود گھوڑے کو نہ دانہ ملتا ہے اور نہ اس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی سائیس ہے۔ سوؔدا نے گھوڑے کی کمزوری، لاغری، ضعیفی اور ناتوانی کی مضحکہ خیز تصویر پیش کی ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ نظم کیا ہے کہ ایک سوؔدا کو کہیں جانا تھا اور انہوں نے اپنے دوست سے گھوڑا مستعار مانگا۔ دوست نے راست طور پر انکار کرنے کی بجائے گھوڑے کی خستہ حالی کی تفصیل سنائی۔

اس قصیدہ میں سوؔدا نے الفاظ کے برمحل انتخاب، محاوروں کے برجستہ استعمال اور طنز وظرافت کے ذریعے لطف کو دوبالا کر دیا۔ چوں کہ قصیدہ میں شوکتِ لفظی اور زورِ بیاں سے بھی جان پیدا ہوئی ہے۔ سوؔدا نے جو ایک کامیاب قصیدہ نگار شاعر ہیں۔ اس ہنر سے بھی بہت کام کیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے سوؔدا کا یہ قصیدہ ایک کامیاب ہجویہ قصیدہ کے تمام فنی لوازم، ہنرمندی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔

محاکمہ:

قصیدہ ہمارے ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ قصیدہ شعری صنف کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ انگریزی میں اسے Eulogy کہتے ہیں۔ قصیدہ لفظ قصد سے مشتق ہے جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق اس کے معنی مغز کے بھی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قصیدہ تمام اصنافِ سخن میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو انسانی جسم میں سر یا مغز کی ہے۔ اس کو فارسی میں چامہ کہتے ہیں۔ یوں تو قصیدہ کے اصطلاحی معنی کسی زندہ شخصیت کی تعریف کرنا کے ہیں۔ اس کو جنگی ادوار میں سرداروں اور قبائلی حکام کی تعریف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عرب کی فتوحات کی بدولت یہ صنفِ شاعری ایران میں آئی اور پھر یہاں سے برصغیر میں منتقل ہوتی چلی گئی۔

قصیدہ دراصل درباری طرز کی شاعری ہے جس میں شان وشوکت، جاہ وجلال، جوش اور ولولے کو امتیازی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ شاہی درباروں میں قصیدے کو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی مگر مغلیہ دور کے زوال کے ساتھ ہی اس صنفِ شاعری کا رنگ کچھ پھیکا پڑنا شروع ہو گیا اور یہ صنف حمد و نعت میں زم ہوتی چلی گئی۔

اس اکائی میں قصیدے کی تعریف، خصوصیات، اجزاء اور تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ اس اکائی میں ہم نے ایک نہایت مشہور قصیدہ نگار سوؔدا کی قصیدہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ایک قصیدہ ''در ہجو اسپ المسمیٰ بہ تضحیکِ روزگار'' کو تشریح کے ساتھ درج کیا ہے اور اس قصیدہ کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی محاسن کی نشان دہی کی ہے۔ اس اکائی میں پوچھے گئے سوال کا جواب بھی دیا گیا ہے تاکہ اس اکائی سے متعلق دیگر اہم سوالوں کے جوابات دینے میں طلبا کی رہنمائی ہو سکے۔ اس اکائی میں شامل نئے الفاظ کو معانی کے ساتھ درج کیا گیا ہے اور اس اکائی سے متعلق چند اہم کتابوں کی سفارش کی گئی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ طلبا ان کتابوں سے بھی استفادہ کریں گے۔

کلیم الدین احمد ذوقؔ کی قصیدہ نگاری پہ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ذوقؔ نے بھی قصیدے نہایت اہتمام وکاوش سے لکھے ہیں اور ہر قصیدے کا رنگ جدا ہے، ہر قصیدے میں ایک نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

فراق گورکھپوری ذوقؔ کی قصیدہ نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''ذوقؔ کے کلام میں اردو نے اپنے آپ کو پایا، روایتی باتوں کو اتنی سنوری ہوئی اور مکمل شکل میں پیش کر دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے آسانی کے ساتھ بھلایا نہیں جا سکتا۔''

اگرچہ فنی اعتبار سے سوداؔ کے قصائد نقشِ اول ہیں تو ذوقؔ کا قصائد نقشِ دوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذوقؔ کے قصائد رہتی دنیا تک بشکل کتاب ہاتھوں کی اور بشکل الفاظ لوگوں کے لبوں کی زینت بنتے رہیں گے جو ان کے مقام و مرتبہ کو بڑھاتے رہیں گے۔

اس اکائی میں شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی کے حالاتِ زندگی، خصوصیاتِ کلام اور قصیدہ ''درمدح بہادر شاہ ظفر'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جانچ:

۱۔ قصیدہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی کیا ہیں؟

۲۔ قصیدہ کے اصطلاحی معنی کیا ہے؟

۳۔ قصیدے کی کتنی اقسام ہیں؟

۴۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی تحریر کیجئے۔

۵۔ قصدہ کی ابتداء اور ارتقاء کی وضاحت کیجئے۔

۶۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے؟

۷۔ نصاب میں شامل شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کا قصیدہ کس مغل بادشاہ کی مدح میں لکھا گیا ہے؟

۸۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

۹۔ سوداؔ کا قصیدہ ''درہجو اسپ المسمیٰ بہ تضحیکِ روزگار'' کا عمومی جائزہ لیجئے۔

۱۰۔ سوداؔ نے قصیدہ میں گھوڑے کی جو حالت بیان کی ہے اس کی تفصیل بتائیے۔

۱۱۔ جب دھوبی اور کمہار نے گھوڑے کو پکڑا تو سوار کی حالت کیا تھی؟

معاون کتب

۱۔	انتخابِ قصائد	شیخ ابو محمد سحر
۲۔	کلیاتِ سوداؔ	ڈاکٹر مسیح الزماں
۳۔	افکارِ سوداؔ	شاربؔ ردولوی
۴۔	تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی
۵۔	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار

اردو مثنوی : تعارف اور صنفی خصوصیات

تمہید

مثنوی اردو شاعری کی اہم صنف ہے۔ اس صنف میں غزل کی رعنائیاں بھی ہیں اور قصیدہ کی شان و شوکت بھی، رندان بلانوش کی ہائے ہو کے

نعرے بھی ہیں تو صوفیوں کی اللہ اکبر کی صداؤں کے ساتھ حسن وعشق کی داستانیں بھی ہیں، غرض کون سا راگ ہے جو مثنوی کے ساز پر نہیں گایا گیا ہو۔

مثنوی انسانی زندگی کے اعمال و کردار پر روشنی ڈالتی ہے نیز واقعات کے تسلسل کے ساتھ ارادوں کی کشمکش اور حرکات و اعمال کی جدوجہد بھی اس صنف میں نظر آتی ہے۔

مثنوی ''گلزارِ نسیم'' دیا شنکر نسیم کی لکھی ہوئی شہکار مثنوی ہے۔اس مثنوی کا قصہ گلِ بکاولی کے نام سے مشہور ہے۔ گلِ بکاولی کا قصہ دراصل ایک فارسی داستان ہے جسے نہال چند لاہوری نے اُردو میں ترجمہ کیا۔ دیا شنکر نسیم نے اس کو مثنوی کے پیکر میں ڈھالا اور لازوال کر دیا۔اس مثنوی میں اگر چہ رعایتِ لفظی کی بھرمار زمانے کے رواج کے مطابق پائی جاتی ہے مگر برجستگی نے اس کو خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔اس مثنوی کا شمار اُردو کی دو بڑی اہم مثنویوں میں کیا جاتا ہے اور پروفیسر احتشام حسین نے مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کو شاعرانہ اور فنکارانہ تخلیق کا معجزہ کہا ہے۔

مقاصد

اس اکائی میں مثنوی کی اہمیت، افادیت، تعریف، فن اور آغاز و ارتقا سے واقف کرایا گیا ہے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ مثنوی کی تعریف اور اس کے فن کو سمجھا سکیں۔
- ☆ مثنوی کی خصوصیات واضح کر سکیں۔
- ☆ مثنوی کی تاریخ سے واقف کرا سکیں۔
- ☆ پنڈت دیا شنکر نسیم کے اسلوب اور زبان کا جائزہ لے سکیں۔
- ☆ مثنوی گلزار نسیم کی خصوصیات بیان کر سکیں۔

آموزشی ماحصل

۱۔ طلباء شعری اصناف کی پہچان رکھتے ہیں۔

۲۔ طلباء مثنویاں پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

۳۔ طلباء مثنوی کی تعریف اور تاریخ جانتے ہیں۔

۴۔ طلباء اُردو کی شہکار مثنویوں کی جانکاری رکھتے ہیں۔

۵۔ طلباء دیا شنکر نسیم کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارناموں کی جانکاری رکھتے ہیں

۶۔ طلباء مثنوی گلزارِ نسیم کے قصے سے محظوظ ہوتے ہیں

۷۔ طلباء مثنوی گلزارِ نسیم کی خصوصیات سے واقف ہیں۔

مثنوی کی تعریف اور اس کا فن

شعری اصناف میں مثنوی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا حالؔی نے اسے سب سے کارآمد صنفِ سخن قرار دیا ہے۔مثنوی عربی زبان کے لفظ ''مثنیٰ''

سے مشتق ہے جس کے معنی دو دو یا دو جُز والی چیز یا دوہرا کرنا ہیں۔۔اصطلاح میں مثنوی اُس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ وہم ردیف ہوں۔مگر ہر شعر کا قافیہ مختلف ہو۔مثنوی بے حد مختصر بھی ہوسکتی ہے اور نہایت طویل بھی۔اس کا آرٹ بیانیہ اور توضیحی ہوتا ہے۔مثنوی کا فن بہت کچھ ناول سے ملتا جلتا ہے۔مثنوی کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پلاٹ مربوط اور گتھا ہوا ہو۔واقعات منطقی طور پر آگے بڑھیں۔ قصے میں آغاز، وسط اور انتہا موجود ہو۔علامہ شبلی نے مثنوی کے لیے حسنِ ترتیب، کردار نگاری اور واقعہ نگاری کو ضروری ٹھہرایا ہے۔مثنوی کے لیے سات اوزان مقرر ہیں۔مثنوی اس طویل نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی واقعہ تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔

مثنوی کی خصوصیات

۱) **تسلسل اور ترتیب**: مثنوی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تسلسل اور ترتیب ہوتا کہ سارے واقعات اور پوری داستان مکمل طور پر ذہن میں آسکے۔

۲) **واقعہ نگاری**: مثنوی میں واقعہ نگاری کے تمام اصولوں کی پابندی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔یعنی واقعے کی تمام اصلی خصوصیات دکھائی جائیں اور معمولی باتوں کو بھی واضح اور نمایاں کیا جائے۔

۳) **کردار نگاری**: مثنوی میں کرداروں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ان مختلف کرداروں کے اخلاق، طرز زندگی، مزاج، گفتگو اور رہن سہن کی تمام امتیازی خصوصیات کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

٤) **اسلوبِ بیان**: مثنوی کی کہانی کتنی ہی دلچسپ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو، اگر سلیقہ کے ساتھ اس کو بیان نہ کیا جائے تو سب بیکار ہے۔ کیونکہ مثنوی کا دارومدار بیان وزبان اور خوب صورت اسلوب پر ہوتا ہے۔

مثنوی کے اجزائے ترکیبی

آیئے اب ہم مطالعہ کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ مثنوی کے اجزاء یا عناصر کیا ہیں؟

۱۔ حمد و نعت

۲۔ مدح فرمانروائے وقت

۳۔ تعریفِ شعر و سخن

۴۔ قصہ یا اصل موضوع

۵۔ خاتمہ

مثنوی کی ابتداء حمد و نعت سے کی جاتی ہے اس میں اپنے رب کی تعریف اور رسول پاک ﷺ کی نعت بیان کی جاتی ہے۔

مثنوی کا دوسرا جز مدح حاکم فرمانروائے وقت ہوتا ہے ان کی تعریف کرنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ درباروں سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے روزی روٹی کا مسئلہ ہوتا ہے اور حکمراں کی تعریف وسیلۂ روزگار تھا۔

مثنوی کے تیسرے حصے میں اپنی شاعری کی تعریف اور تعلّی کی جاتی ہے تا کہ اپنی شاعرانہ اہمیت کو ثابت کیا جاسکے۔

مثنوی کے چوتھے میں اصل قصے تسلسل کے ساتھ اصل قصے کو بیان کیا جاتا ہے۔

مثنوی کے پانچویں حصے میں قصے کا کلائمکس ہوتا ہے۔

مثنوی کی تاریخ

عربی میں مثنویاں نہیں لکھی گئی ہیں۔ جبکہ فارسی میں شاہنامہ فردوسی اور مثنوی مولانا روم جیسی بلند پایہ مثنویاں موجود ہیں۔ فارسی کی تقلید میں سب سے پہلے مثنوی دکن میں لکھی گئیں۔ اردو ادب کی مثنویوں میں فخر الدین نظامی کی مثنوی کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے جو انہوں نے ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے نام سے تصنیف کی۔ یہ مثنوی بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ کے زمانے میں لکھی گئی۔ اسی دور کی ایک اور مثنوی اشرف بیابانی کی ''نوسر ہار'' جس کا موضوع کربلا کا واقعہ ہے۔ دیگر مثنویوں میں عبدلؔ کی ''ابراہیم نامہ''، ملا وجہی کی ''قطب مشتری''، ابنِ نشاطی کی ''پھول بن''، نصرتی کی ''گلشنِ عشق'' وغیرہ شامل ہیں۔

شمالی ہند میں جعفرؔ زٹلی، فائزؔ دہلوی، شاہ مبارک آبرو اور شاہ حاتمؔ نے اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ کی مثنویات بھی اہم ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ دہلوی کی مثنوی ''خواب وخیال'' اسی زمانے میں لکھی گئی۔

میر حسنؔ کی ''سحر البیان''، پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی ''گلزار نسیم'' اور نواب مرزا شوقؔ کی ''زہرِ عشق'' اردو کی سب سے زیادہ مشہور مثنویاں ہیں۔ جو لکھنو میں لکھی گئی ہیں۔ آزادؔ اور حالیؔ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی، علامہ اقبالؔ اور حفیظ جالندھری کی لکھی ہوئی مثنویاں کافی مقبول ہیں۔

گلزارِ نسیم (دیا شنکر نسیم)

شاعر کا تعارف

دیا شنکر نسیمؔ کا اصلی نام پنڈت دیا شنکر کول ہے اور نسیمؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا تعلق ایک کشمیری پنڈت گھرانے کے ساتھ تھا جو کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنو میں آباد ہوا۔ دیا شنکر نسیمؔ لکھنوء میں 1811ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق انہوں نے اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کا مزاج شعر وشاعری کیلئے موزون تھا اور لکھنو کے ادبی ماحول میں ان کا شعری ذوق خوب پھلنے پھولنے لگا۔ بیس سال کی عمر میں نسیم نے شاعری کی شروعات کی۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شاگردی میں انہوں نے جلد ہی اپنے فن کو جلا بخشی اور بہت کم وقت میں بہت زیادہ شہرت پائی۔ نسیمؔ کی غزلوں میں اساتذہ کا رنگ نظر آتا ہے اور ان پر ان کے استاد کا گہرا اثر ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی وفات 1843ء میں بتیس سال کی عمر میں ہوئی۔ مگر گلزارِ نسیم نے ان کو ہمیشہ کیلئے زندہ جاوید کر دیا۔

مثنوی گلزار نسیم اور اس کا اسلوب

گلزارِ نسیم اُردو کی مشہور مثنوی ہے، گلزارِ نسیم ایک طویل مثنوی تھی لیکن نسیم نے اپنے استاد آتشؔ کے کہنے پر اس کو مختصر کر دیا، گلزار نسیم اردو ادب کے خزانے میں ایک انمول رتن کی حیثیت رکھتی ہے۔ گلزارِ نسیم (۳۹۔۱۸۳۸ء) میں لکھی گئی اور یہ ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ گلزارِ نسیم میں گل بکاؤلی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے مترجم نہال چند لاہوری نے اسی قصہ کو نثری شکل میں فارسی سے اُردو میں منتقل کیا ہے نسیم نے اس کو نظم کی شکل دی۔ دراصل یہ قصہ فارسی میں عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔

گلزار نسیم میں تشبیہہ واستعارات کی کثرت، لفظی اور معنوی رعایت اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ کر ایسا جادو جگایا ہے کہ چھوٹی سی کہانی میں مختلف معنوی امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

مثنوی گلزار نسیم کو دبستان لکھنو کی شاعری کا ایک مثالی نمونہ کہا جاتا ہے دیا شنکر کے زمانے میں لکھنو کی شاعری میں جو شائستگی، مرصع کاری اور تکلفات کا رواج تھا وہ گلزار نسیم میں پوری طرح سے نظر آتے ہیں۔

دیا شنکر نے نثری قصے کی تفصیلات کو نظم میں بہت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، انہوں نے صنائع لفظی خاص طور پر رعایت لفظی کو اپنا شیوہ بنایا ہے

اوران کے سلیقے نے اس کو معنی آفرینی کا ایک نمونہ بنا دیا ہے لفظوں کی رعایت کو اس طرح سے ملحوظ رکھا ہے کہ اس التزام سے پہلو دار انداز کی تشکیل ہو جس میں معنویت کی تہہ ہوں اور پھر ان پہلو دار لفظوں کو ایسی چست بندش کے سانچے میں ڈھالا کہ شعر بولتے ہوئے پیکر بن گئے، اس معنوی تہہ داری اور چست بندش کے فیض سے مثنوی گلزار نسیم کے بہت سے اشعار ضرب المثل کی طرح دہرائے جاتے ہیں، یہ بات کسی مبالغہ کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ نسیم نے بڑی مہارت اور سلیقے کے ساتھ اشعار کو شیشے میں اتارا ہے۔ اُردو میں کوئی دوسری اتنی طویل نظم شاید ہی پیش کی جا سکے جس میں چند مقامات کو چھوڑ کر رعایت لفظی سے اشعار میں ایسے پہلو داری پیدا کی گئی ہو۔

دیا شنکر کول نے جتنے بھی الفاظ ضروری سمجھے اتنے ہی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے مفہوم کو سمجھانے کے لیے کم سے کم الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ بندش کی چستی کے رنگ کو مدھم نہ پڑنے دیا۔ انہوں نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ نظم میں اشعار کے اختصار کی وجہ سے اشعار کا لطف بھی کم نہ ہونے پائے۔ ان کے اشعار چستی اور بندش کی وجہ سے اُردو شاعری میں نمونوں کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

گلزار نسیم اگر مختصر ہونے کے بجائے طویل ہوتی تو اس کے اندر بھدا پن آنے کا امکان تھا، دیا شنکر نسیم نے اس مثنوی کو حسن و بیان اور حسن وقبول دونوں بخشے ہیں، گلزار نسیم میں جذبات نگاری، جزئیات نگاری کی عکاسی اور مناظر کی تصویر کشی مقصود ہے، اس کے اشعار میں چمک ہے، دل کشی ہے، لیکن تاثیر کی گرمی نہیں، گلزار نسیم نے مثنوی نگاری میں ایک نئے انداز کا اضافہ کیا ہے جو کہ اس سے قبل متعارف نہ تھا۔ ویسے تو یہ اس طرز کی منفرد مثنوی ہے اس مخصوص اور محدود دائرے میں اس میں سارے محاسن موجود ہیں جن سے انداز کی یکتائی کے نقش و نگار بنتے ہیں۔

اُردو میں اچھا خاصا ذخیرہ ایسی داستانوں کا ہے جو کہ ہندوستانی اور ایرانی عناصر آمیز ہیں، پریاں ہوں کہ دیو، جادوگر ہوں، یا حکیم، طلسمات کا شہر ہو یا پھر انسانوں کی بستی، یورپ کا کوئی شہنشاہ ہو یا پھر مغرب کا کوئی شہزادہ، ان سب کے رہن سہن، رسم و رواج میں وہ سارے اجزاء خلط ملط نظر آئیں گے جو کہ ہند ایران معاشرت کی پیداوار ہیں۔

مثنوی گلزار نسیم بھی اسی ہند ایرانی داستان کی ایک کڑی ہے۔ یورپ کا ایک شہزادہ ہے جس کے نام سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے اور پھر پریوں کے دیس تک یہ سلسلہ پہنچتا ہے۔

مثنوی گلزارِ نسیم کا خلاصہ

سوال: مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کا خلاصہ پیش کیجئے۔

جواب: مثنوی ''گلزارِ نسیم'' پنڈت دیا شنکر نسیم کی ایک شہکار مثنوی ہے۔ نسیم اپنی اس مثنوی کی وجہ سے اُردو ادب کی تاریخ میں اپنا ایک خاص مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس مثنوی کی بنیاد ایک فارسی داستان پر ہے جو عزت اللہ بنگالی نے لکھی ہے۔ فارسی سے اُردو میں اس کا ترجمہ نہال چند لاہوری نے کیا مگر نسیم نے مثنوی کے پیکر میں ڈھال کر اس قصے کو بے انتہا مقبولیت بخشی۔ نسیم نے یہ مثنوی بہت طویل لکھی تھی مگر استاد آتش کے مشورے پر اس کو مختصر کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ مثنوی رمز و کنایہ کے حسن و جمال سے مالا مال ہوگئی۔ اس مثنوی کی کہانی یہ ہے کہ بادشاہ زین الملوک اپنے پانچویں بیٹے تاج الملوک کی خوب صورتی دیکھ کر آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اپنے چار بھائیوں کی سازش سے تاج الملوک شہر بدر ہو جاتا ہے۔ جن کے سامنے اب ایک بڑا مسئلہ یہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کی بینائی کیسے واپس لائی جا سکتی ہے۔ بینائی واپس لوٹانے کی ایک ہی ترکیب یہ تھی کہ بکاؤلی کا پھول لایا جائے۔ اس پھول کی تلاش میں چاروں شہزادے نکل پڑتے ہیں۔ لیکن وہ چاروں ایک بدکار عورت دلبر کے غلام بن جاتے ہیں۔ ادھر تاج الملوک کو یہ بات کسی طرح معلوم ہوتی ہے تو وہ اس مہم پر چل پڑتا ہے اور دلبر کو جیت لیتا ہے۔ اس کو ایک دیو سے بھی سابقہ پڑتا ہے تو اس کو اپنی عقل سے ہرا کر پھر تاج الملوک دیونی حمالہ سے مدد پانے میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔ حمالہ دیونی کوہِ قاف کی پری کے باغ سے بکاؤلی کا پھول لانے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ جس سے وہ اپنے

باپ کی بینائی واپس لانے میں بھی کامیاب ہوتا ہے اور بکاؤلی کے دل میں اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ بکاؤلی اپنے باغ میں پھول کو نہ پا کر بہت پریشان ہوجاتی ہے۔ وہ صبح سویرے جب جاگتی ہے تو پھول کو غائب پا کر بالکل پاگل سی ہوجاتی ہے۔ نرگس، سوسن، سنبل، شمشاد، سبزہ، ہوا، غرض ہر ایک سے اس کا پتہ پوچھتی ہے مگر کوئی بھی اس گل کا پتہ نہیں بتا پاتا ہے۔ سب اپنی بے خبری کا اظہار کر کے افسوس کرتے ہیں۔ بکاؤلی یہ سب دیکھ کر بہت مایوس ہوجاتی ہے۔ کبھی اپنی تقدیر کا رونا روتی ہے تو کبھی اُس گل کے چرانے والے کو کوستی ہے۔ آخرکار بکاؤلی ہر طرف سے مایوس ہوکر اپنی سہیلی سمن پری کو کہتی ہے کہ گل کے بغیر اب اُسے سکون نہیں مل سکتا اس لئے اس کی تلاش اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ یہ کہہ کر بکاؤلی گل کی تلاش میں نکل پڑتی ہے اور ہر باغ وگلستان میں اس کی تلاش کرتی ہے۔ اسی تلاش میں اس کی شہزادہ تاج الملوک سے آنکھیں چار ہوتی ہیں اور دونوں کا آخر کا ملاپ ہوتا ہے۔

محاکمہ

مثنوی ہیئت کے اعتبار سے بیانیہ نظم ہے، قافیہ کی گنجائش کے باعث اس میں تفصیل سے کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔ اسی لیے اردو شعراء نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور طویل داستانوں کو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے۔ مثنویوں میں عشق ومحبت کے موضوع کے علاوہ عجیب وغریب واقعات اور فوق الفطری کردار، مذہب، اخلاق اور سماجی ومعاشی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، مثنویوں میں خارجی ماحول حاوی نظر آتا ہے۔ مثنویوں نے زبان وبیان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور زبان کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ اس اکائی میں مثنوی کے اجزاء اور مثنوی کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔

مزید ہم نے مثنوی گلزار نسیم کا مطالعہ کیا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کے اسلوب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی روشنی میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی زبان وبیان کو سمجھا جاسکے۔ مثنوی کی خوبیوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

جانچ

۱۔ مثنوی کی تعریف بیان کیجئے۔

۲۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔

۳۔ دکن کی مشہور مثنویوں کے نام بتائیے۔

۴۔ اُردو کی شہکار مثنویوں کے نام بتائیے۔

۵۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی زبان وبیان کی خوبیوں کو واضح کیجئے۔

۶۔ جاگنے کے بعد بکاؤلی نے کیا دیکھا؟

۷۔ وہ شعر لکھئے جس میں پھول چرانے والے کے لیے بددعا کی گئی ہے؟

معاون کتب

۱۔ مثنوی گلزارِ نسیم — مرتب رشید حسن خاں

۲۔ تاریخِ مثنویات اُردو — جلال الدین احمد

۳۔ اُردو مثنوی کا ارتقاء — پروفیسر عبدالقادر سروری

۴۔ تاریخ ادب اُردو — نورالحسن نقوی

اردو مرثیہ: تعارف اور صنفی خصوصیات

تمہید؛

مرثیہ عربی زبان سے فارسی میں داخل ہوا ہے اور دیگر اصناف کی طرح سے اُردو میں فارسی زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔ اردو مرثیہ عربی شاعری کے مقابلے میں فارسی شاعری سے زیادہ متاثر ہوا۔ اُردو میں کربلائی اور شخصی مرثیے لکھے گئے۔ اس میں ابتداء میں لوازمات شعری کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں لوازمات شعری اور فن پر بہت توجہ دی گئی۔ مرثیہ شاعری میں کمال کی انتہاء کو پہنچا اور ''بگڑا شاعر مرثیہ گو'' کا مقولہ غلط قرار پایا۔ ضمیرؔ، انیسؔ، دبیرؔ، جوشؔ وغیرہ نے مرثیہ کے فن کو عروج بخشا اور اس کے اندر فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے۔

اس اکائی میں مرثیہ کی تعریف، اجزاء اور تاریخ کی وضاحت پیش کی جائے گی۔ ساتھ ہی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی وضاحت بھی کی جائے گی۔

مقاصد:

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ مرثیہ کی تعریف کو سمجھ سکیں۔
- ☆ مرثیہ کے سماجی اور مذہبی پس منظر کو تاریخ کے تناظر میں سمجھ پائیں گے۔
- ☆ مرثیہ کے اجزا کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ مرثیہ کی تاریخ کا جائزہ لے سکیں۔
- ☆ انیس اور دبیر کے متعلق کوائف کو بیان کر سکیں۔
- ☆ انیس اور دبیرؔ کے مرثیہ نگاری کی خصوصیات کو سمجھ سکیں۔

آموزشی ماحصل

۱۔ طلباء شعری اصناف کی پہچان رکھتے ہیں۔

۲۔ طلباء مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۳۔ طلباء مرثیوں کو پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

۴۔ طلباء مرثیہ کی تعریف اور تاریخ جانتے ہیں۔

۵۔ طلباء اُردو کے مرثیہ نگاروں کی واقفیت رکھتے ہیں۔

۶۔ طلباء انیسؔ اور دبیرؔ کے حالاتِ زندگی سے واقف ہیں۔

۷۔ طلباء انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیہ نگاری کی خصوصیات کی جانکاری رکھتے ہیں۔

۸۔ طلباء انیسؔ اور دبیرؔ کے لکھے ہوئے مرثیے پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

مرثیہ کی تعریف اور اس کا فن

مرثیہ اُردو شاعری کی قدیم صنف ہے۔ مرثیہ لفظ ''رثاء'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ''رونا''، ''ماتم کرنا'' اصل میں مرثیہ سے مراد وہ نظم ہے جس

میں کسی مرحوم کے صفات بیان کر کے اُس کی موت پر رنج وغم کا اظہار کیا جائے۔لیکن اُردو میں مرثیہ اُس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں حضرت امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے۔دوسرے لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیے کا نام دیا جاتا ہے۔مثلاً حالؔی کا مرثیۂ غالبؔ، اقبالؔ کا مرثیہ داغؔ وغیرہ۔سوداؔ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مرثیے کے لئے مسدس کی ہیئت استعمال کی اور میر ضمیرؔ نے مرثیے کے لئے اجزائے ترکیبی متعین کیے جو حسبِ ذیل ہیں

مطلب یہ ہے کہ مرثیہ کسی کی موت پر لکھا جاتا ہے اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ مرثیہ میں مرنے والے کے اوصاف کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بہت سے اضافی موضوعات بھی شامل ہو گئے۔

عربی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ عرب میں مرثیہ کو بڑی مقبولیت حاصل تھی اور یہ عربی شاعری کی قدیم ترین صنف میں شمار کیا جاتا ہے۔ عربی شعراء کسی بھی اہم شخصیت کے مرنے پر اپنے پُر اثر پیرائیہ بیان میں اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

مرثیہ ایک موضوعاتی صنف ہے نہ کہ ہیئتی کیونکہ مرثیے مختلف ہیئتوں میں لکھے گئے ہیں غزل کی ہیئت میں بھی اور مسدس کی ہیئت میں بھی اور مسدس کی ہئیت میں بھی۔دراصل مرثیہ کہ پہچان اس کے موضوع سے ہوتی ہے یعنی کسی کی موت پر اظہار رنج وغم کرنا۔

مرثیہ کا سماجی اور مذہبی پس منظر: مرثیہ کا نام آتے ہی ہمارا دھیان واقعات کربلا کی طرف چلا جاتا ہے اور کربلا کے مرثیہ کو ہی اصل مرثیہ سمجھ لیا جاتا ہے۔حالانکہ مرثیہ عربی شاعری کی اہم صنف ہے اور عرب میں شخصی مرثیہ نگاری کو رواج دیا ہے اپنے کسی عزیز کے مرنے پر اپنے جذبات کا اظہار مرنے والے کی خوبیوں کے بیان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد مرثیہ میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزہ کی شہادت کا بیان شدت سے کیا جانے لگا اس کے بعد جب عربی شاعری ایران پہنچی تو عجمی اثرات کی باعث رثائی شاعری میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

اردو شاعری پر ایرانی اثرات کے باعث اردو میں ابتداء ہی سے مرثیہ نگاری کا رواج رہا ہے اور دکنی شاعری میں اس کے ابتدائی نمونے بکثرت موجود ہیں۔بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمراں شیعہ عقائد کے حامل تھے۔تعزیہ داری کے ساتھ وہ عاشور خانوں میں خصوصی مجالس کا اہتمام کیا کرتے تھے۔وجہیؔ، غواصیؔ، غواصیؔ، شاہیؔ اور ہاشمی نے حضرت امام حسین اور آپ کے اعزہ کی شان میں مرثیہ لکھے۔ان مرثیوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مرثیہ کے اقسام:

مرثیہ کے موضوعات: اُردو شاعری میں مرثیہ کے موضوعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کربلائی مرثیہ ۲۔ شخصی مرثیہ

کربلائی مرثیہ: کربلا کے واقعات میں شہادت امام حسینؑ ایک سانحہ ہے جو کہ تاریخ اسلام ہی میں نہیں بلکہ تاریخ ادب میں بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ان واقعات کو شاعروں نے مرثیوں کا موضوع بنایا ہے، یہ شخصی مرثیہ کی طرح سے نہیں ہوتے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ان میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزہ کی شہادت اور دیگر واقعات کو مرثیہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔

شخصی مرثیہ: اس میں عزیزوں اور قوم کے مقتدر لوگوں کی موت پر اظہار رنج وغم کیا جاتا ہے، جیسے غالبؔ کی وفات پر حالؔی کا مرثیہ یا عارف کی وفات پر غالبؔ کا مرثیہ۔اس کے علاوہ کچھ سیاسی لوگوں کے بھی مرثیہ لکھے گئے، جیسے گوکھلے اور تلک کا مرثیہ پنڈت برج نارائن چکبستؔ نے لکھا ان میں انہوں نے مرثیہ کے اجزاء کا اہتمام نہیں کیا بلکہ قومی اشخاص کے مرثیے جذباتی انداز میں پیش کئے جن کے اندر صرف شخصیت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی:

ابتداء میں مرثیہ کی کوئی ہیئت یا فارم متعین نہ تھی۔شروع میں مرثیہ غزل کی ہیئت میں پھر چار مصرعوں کی شکل میں اور پھر اس کے بعد میں مرزا محمد رفیع سوؔدا نے مرثیہ کے لئے مسدس کی ہیئت متعین کردی۔ میر ضمیؔر نے اسے آٹھ حصوں میں تقسیم کردیا۔وہ حصے یہ ہیں:

۱۔ **چہرہ:** چہرہ مرثیے کی تمہید کو کہتے ہیں۔اس میں شاعر مختلف مضامین پیش کرتا ہے۔

۲۔ **سراپا:** اس حصے میں مرثیے کے ہیرو کا قد و قامت، چہرہ اور دیگر اوصاف کو بیان کیا جاتا ہے۔

۳۔ **رخصت:** اس حصے میں ہیرو کو حضرت امام حسینؑ اور دیگر رشتہ داروں سے رخصت لیتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

۴۔ **آمد:** اس حصے میں ہیرو کا میدان جنگ میں آنے کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔

۵۔ **رجز:** اس حصے میں ہیرو اپنے خاندان کے بزرگوں کی بہادری بیان کرتا ہے۔

۶۔ **جنگ:** اس حصے میں ہیرو کو بڑی بہادری سے جنگ کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

۷۔ **شہادت:** اس حصے میں ہیرو کو شہید ہوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

۸۔ **بین:** اس حصے میں ہیرو کی لاش پر اُس کے گھر والوں کو ماتم کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے

مرثیہ کی تاریخ:

عربوں میں مرثیہ گوئی کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا۔جب کربلا کا سانحہ پیش آیا تو اس کے کچھ ہی دن بعد بعض عرب شعراء نے اس واقعے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ایران میں بھی حضرت امام حسینؑ اور ان کے اقربا و رفقا کی شہادت پر مرثیے لکھے گئے اور وہاں مرثیہ نگاری کو خوب فروغ ہوا۔ فارسی شعراء میں محتشم کاشی نے مرثیہ گوئی میں سب سے زیادہ نام پیدا کیا۔

اُردو میں شاعری کا آغاز ہوا تو اس صنفِ شاعری کی طرف بطور خاص توجہ کی گئی۔اُردو میں مرثیہ نگاری کا آغاز دکن میں ملاّ وجہؔی کے ہاتھوں ہوا۔سترہویں صدی میں نوری نے اُردو میں مرثیے لکھے۔دکن میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے عہد میں ہاشؔم اور ناظؔم اہم مرثیہ نگار گزرے ہیں۔شاہؔی کے مرثیوں نے بھی شہرت پائی۔

مسکیؔن، گدؔا، سکندؔر، فضلؔ وغیرہ شمالی ہند کے قدیم مرثیہ گو ہیں۔ان کی زبان پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ان کے کچھ مراثی غزل کی شکل میں ہیں اور زیادہ تر مربع کی صورت میں ہیں۔سوؔدا کے زمانے سے مرثیے کی دنیا میں انقلاب آنا شروع ہوا۔ان کے مرثیے مختلف ہیئتوں میں پائے جاتے ہیں۔انہوں نے پہلی بار مسدس کو بھی مرثیے کے لیے اختیار کیا۔آگے چل کر میر ضمیؔر نے مرثیے کے لیے اسی کو مخصوص کردیا۔انہوں نے مرثیے کے اجزا بھی متعین کیے۔میر ضمیؔر اور میر خلیؔق نے مرثیے کے ایک شاندار عہد کی داغ بیل ڈالی اور اسے ایک مستقل اور باقاعدہ صنف سخن کا درجہ عطا کیا۔اس میں زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کیں۔انیسویں صدی کے آخر میں میر انیؔس اور مرزا دبیؔر نے اردو مرثیے کو معراج کمال تک پہنچادیا۔

میر انیؔس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی میر محمد نواب مونؔس نے خاندانی روایت کو جاری رکھا اور مرثیے کہتے رہے۔سید محمد مرزا انسؔ بھی اچھے مرثیہ گو تھے۔ناسخ کے شاگرد تھے۔اس کے بعد سید مرزا تعشؔق کا ذکر مرثیہ نگاری کے حوالے سے آتا ہے۔

انیؔس کے تین بیٹے سلیؔس، نفیؔس اور رئیؔس بھی مرثیے کہتے تھے۔میر نفیؔس کے نواسے سید علی محمد عارؔف بھی اچھے مرثیہ گو گزرے ہیں۔ پیارے صاحب رشید کو آخری باکمال مرثیہ گو کہا جاسکتا ہے۔دبیؔر کے صاحبزدے مرزا محمد جعفر اوؔج بھی اچھے مرثیہ گو ہوئے ہیں۔دورِ جدید میں جمیؔل مظہری اور حفیظ جالندھری نے بھی اچھے مرثیے لکھے ہیں۔

مرثیہ ''جنگ کے لئے عون و محمد کی رخصت''

تمہید

میر ببر علی انیسؔ اور مرزا سلامت علی دبیر کا شمار اُردو مرثیہ نگاری کے دو بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ان دونوں کا طرز بالکل جُدا جُدا ہے۔انیسؔ کے یہاں زبان کی صفائی،شیرین بیانی،بندش کی چستی اور محاورے کی درستی پر زور دیا گیا ہے تو دبیرؔ نے جدتِ خیالات،بلند تخیل،نئی تمثیلات اور پُر شکوہ الفاظ استعمال کرنے پر خاص توجہ دی ہے۔انیسؔ نے اردو مرثیہ کی شان بڑھائی ہے،ان کا مشاہدہ زبان و بیان اور جذبات واحساسات کا میلان ان کے مرثیوں کو وقار عطا کرتا ہے۔میر انیس اردو مرثیہ کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔انہوں نے اردو مرثیہ کو ایسا وقار عطا کیا ہے کہ اُردو شاعری دنیا کی کسی بھی شاعری کا مقابلہ کرسکتی ہے،انیس نے اُردو شاعری میں رزمیہ شاعری کی کمی کو پورا کیا ہے۔انیس نے مرثیہ نگاری کی پرانی روایت کو ترک کر کے مرثیہ کے صنف کو نئی سمت عطا کی ہے۔ اس لیے انیسؔ کے کلام میں سادگی اور صفائی پائی جاتی ہے اور دبیرؔ کے یہاں صنعت اور رنگینی۔دبیرؔ نے واقعات کربلا کی تفصیلات پر اتنا زور دیا ہے کہ اختصار کی خوبی بہت کم ہوگئی۔پوری پوری روایتوں اور احادیث کو بنیاد قرار دے کر مرثیوں کو طول دے دیا ہے کہ شاعرانہ لطافت اور ذہنی کاوش کو بلند ہونے کا پورا موقع نہیں ملا۔لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اُنہوں نے اُردو میں عربی کے پیوند اور جوڑ بڑی خوبی سے لگائے ہیں۔

اس اکائی میں ہم اُردو کے دو باکمال مرثیہ نگار شعراء میر ببر علی انیسؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ کا تعارف کرائیں گے اور ان کے خصوصیاتِ کلام اور نصاب میں شامل مرثیوں کا خلاصہ پیش کریں گے۔

میر انیسؔ کا تعارف:

میر ببر علی انیسؔ فیض آباد اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ان کی سنِ ولادت 1803ء ہے۔ان کے خاندان میں کئی پشتوں سے شعر وشاعری چلی آتی تھی۔ان کے پردادا میر ضاحکؔ، دادا میر حسنؔ اور والد میر خلیقؔ سب تاریخِ ادب میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔انیسؔ کی تعلیم فیض آباد میں ہی ہوئی تھی۔عربی اور فارسی میں انہیں کافی مہارت حاصل تھی اور اس کے علاوہ سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا۔شاعری کی شروعات انہوں نے غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی اپنے والد کے مشورے پر مرثیہ گوئی پر توجہ دی۔اس فن میں کمال کی مشق کرنے کے بعد لکھنو کا رُخ کیا اور اپنی ذہانت،روانی،سلاست اور فصاحت و بلاغت کی وجہ سے جلد ہی اس صنف کے ایک عظیم شاعر مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مدِ مقابل قرار دیئے گئے۔لکھنو،بنارس،پٹنہ،الہ آباد اور حیدر آباد جہاں کہیں بھی گئے لوگوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ میر انیسؔ نے شہرت کی اعلیٰ منزل پر پہنچ کر لکھنو میں 1874ء میں انتقال کیا۔

میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات:

مرثیہ کی صنف کو میر انیسؔ نے معراجِ کمال کے درجہ تک پہنچایا انہوں نے نہ صرف شاعری کے تمام لوازمات کا پورا پورا خیال رکھا بلکہ واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور تصویر کشی کی وہ عمدہ مثالیں قائم کی ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں یہ خصوصیات نظر آئیں گی۔انہوں نے قدرتِ بیان کا وہ معجزہ دکھایا کہ ہر موقع اور محل پر ذہنی اور جذباتی کیفیت کو حقیقت پسندانہ رنگ میں پیش کر دیا ہے۔مرثیہ کی صنف میں کئی بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے مگر جو رتبہ اس میں میر انیسؔ کو حاصل ہوا وہ کسی کے بھی حصے میں نہیں آیا۔انیسؔ نے تقریباً دو لاکھ شعر لکھے ہیں۔مرثیہ کی صنف کو انہوں نے بامِ عروج تک پہنچایا۔ انہوں نے مرثیہ کی صنف میں قصیدے کی شان،غزل کا حسن اور درد واثر،مثنوی کے کمالات اور ڈرامے کے مکالمے سمو کر اس کو ایک نئے روپ میں ڈھالا۔ مرثیہ کی صنف کو معراجِ کمال پر پہنچا کر انہوں نے شاعری کا درجہ بلند کر دیا اور زبان کا دامن معنوی اور لفظی جواہرات سے مالا مال کیا۔ان کے مرثیوں میں میدانِ کربلا کے اکثر و بیشتر بہادروں سے تعارف ہوجاتا ہے جنہوں نے حق و باطل کی جنگ میں سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔انیسؔ یزیدی فوج کی سنگ دلی اور ناانصافی کی متحرک تصویریں پیش کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔انیسؔ انسانی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔اسلئے ان کی کردار نگاری بڑی جاندار ہے۔ وہ واقعات اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ جیسے تصویر کھینچ دی گئی ہو۔شاعری اور زبان دانی انیسؔ کو وراثت میں ملی تھی۔نزع کی حالت،گرمی کی شدت میں

لوگوں کی حالت، کم عمر بچوں کی کیفیت، فوجوں کی آمد، جنگ کی تباہ کاری، سفر کی تیاری اور پردہ کا اہتمام وغیرہ غرض جو بھی صورتِ حال انہوں نے پیش کی بس اُن کے ہی بس کی بات تھی۔

مرزا دبیرؔ کا مختصر تعارف:

مرزا دبیرؔ کا اصلی نام مرزا سلامت علی تھا۔ان کی پیدائش 1803ء میں دہلی میں ہوئی۔ان کے والد مرزا غلام حسین نے لکھنو کی ہجرت کی جہاں مرزا دبیرؔ کو شعروادب کا ماحول ملا۔مرزا دبیرؔ نے کم عمری سے ہی شعروشاعری کی طرف توجہ دی اور میر ضمیرؔ کے شاگرد ہوگئے یہ مرزا دبیرؔ کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں میر ضمیرؔ جیسا استاد ملا جس نے اُردو مرثیہ کی بنیاد کھڑی کرنے میں بڑا اہم کردار نبھایا تھا۔مرزا دبیرؔ کی ذاتی رغبت اور محنت نے بھی استاد کی بہترین رہبری کے سہارے پھل پھول لانے شروع کیے اور دبیرؔ جلد ہی مرثیہ کی صنف کے بڑے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔دبیرؔ کا آخری زمانہ بڑی مشکلوں میں گزرا۔ جوان بیٹے کی موت کا صدمہ اور آنکھوں کی روشنی کھو دینے کا غم ان کی جان لے کر رہ گئے۔ان کا انتقال 1875ء میں لکھنو میں ہوا۔

مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات:

دبیرؔ ایک عالم فاضل شخص تھے۔مگر ان کی علمیت نے ان کے فن کو بڑا نقصان پہنچایا۔وہ جگہ جگہ عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو طبیعت کو ناگوار ہوتے ہیں۔صنعتوں کی کثرت بھی دبیرؔ کے مرثیوں کا اثر کم کر دیتی ہے۔مرزا دبیرؔ اپنے مدِ مقابل انیسؔ کی طرح مرثیہ پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔جس مجلس میں پڑھتے کہرام مچا دیتے تھے اور لوگ روتے روتے بے ہوش ہونے لگتے تھے۔مرزا دبیرؔ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ان کے مرثیوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ان کی زبان شاندار اور پُرشکوہ تھی۔اکثر نئی تشبیہات اور تازہ مضامین باندھنے کا کمال ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

خلاصۂ مرثیہ :

میدانِ کربلا میں زبردست جنگ جاری تھی اور حضرت امام حسینؓ کے تمام دوست اور ساتھی ایک ایک کر شہید ہو چکے تھے۔حضرت امام حسینؓ نے اپنے بھانجوں حضرت عون اور محمدؓ کو ان کی کم عمری کی وجہ سے جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دی جبکہ حضرت زینبؓ کو یہ غلط فہمی تھی کہ اُن کے دونوں بیٹے جنگ میں جانے سے ڈر رہے ہیں اسلیئے وہ اُن سے ناراض تھیں۔وہ خیمے میں دوسروں کے سامنے اپنے بیٹوں کی شکایت کر رہی تھیں اور اپنی تقدیر کو کوستی ہوئی رو رہی تھیں۔لیکن جب اُنہیں اصلیت معلوم ہوتی ہیں تو اُن کی ساری ناراضگی دور ہو جاتی ہیں اور وہ خود اپنے ہاتھوں سے دونوں بیٹوں کے جسم پر جنگ کے ہتھیار سجاتی ہیں اُن کا حوصلہ بڑھا کر اُن کو خوشی خوشی جنگ کے لئے روانہ کرتی ہیں۔

تشریح مرثیہ ”جنگ کے لئے عون مو محمد کی رخصت“

حوالہ: درج ذیل بند ہماری نصابی کتاب ”بہارستانِ اُردو“ میں درج مرثیہ ”جنگ کے لئے عون مو محمد کی رخصت“ سے لیا گیا ہے جو میر ببر علی انیسؔ کے لکھے ہوئے مرثیہ کا ایک حصہ ہے۔مرثیہ کے اس حصے میں وہ منظر بیان کیا گیا ہے جب کربلا کا میدانِ جنگ گرم ہے، امام حسینؑ کے سارے رفقاء مارے جا چکے ہیں۔امام حسینؑ اپنے بھانجوں حضرت عونؑ اور محمدؑ کو ان کی کمسنی کی وجہ سے معرکہ آرائی سے روکے ہوئے ہیں۔حضرت امام حسینؑ کی بہن جناب زینبؓ یہ سمجھیں کہ اُن کے دونوں بیٹے عونؑ و محمدؑ خود جنگ کرنے سے جھجک رہے ہیں۔اس پر وہ خیمے میں اپنے پاس بیٹھی ہوئی خواتین سے اپنے بیٹوں کی شکایت کرنے لگیں۔جب بچے امامؑ سے جنگ میں جانے کی اجازت لے کر خیمے میں داخل ہوتے ہیں اور تاخیر کی اصلی وجہ معلوم ہو جاتی ہے تو جناب زینبؓ بہت خوش ہو جاتی ہیں۔بیٹوں کے جسم پر اپنے ہاتھ سے جنگ کے ہتھیار سجاتی ہیں اور ان کو ہمت دلاتی ہیں کہ تم جعفر طیارؓ کے پوتے اور حیدر کرارؓ کے نواسے ہو، اس طرح جنگ کرنا کہ رہتی دنیا تک تمہارا نام رہے۔یہ پورا ٹکڑا ڈرامائیت، زبان اور فصاحت و بلاغت کا اعلاترین نمونہ ہے۔

بند نمبر 1: اس بند میں میر انیسؔ فرماتے ہیں کہ حضرت زینبؓ خیمے میں اپنے پاس بیٹھی ہوئی چند بیبیوں سے اپنے بیٹوں کی شکایت کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میری قسمت میں جو لکھا ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔میری رُوح تب مطمئن ہوگی جب وہ میدان کربلا میں شہادت کا جام نوش کریں گے۔میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ وہ دونوں کس فکر میں پڑے ہیں انہوں نے حضرت امام حسینؑ سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت اب تک کیوں نہیں لی ہے اسی بات پر

میں اُن سے خفا ہوں اب وہ جو چاہیں کریں اُنہیں اب میرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ نہ وہ اب میرے بیٹے کہلانے کے مستحق ہیں اور نہ میں اُن دونوں کی ماں ہوں۔

بند نمبر 2: اس بند میں میر انیسؔ کہتے ہیں کہ جب حضرت زینبؓ خیمے میں دیگر بیبیوں کے سامنے اپنے بیٹوں کی شکایت کر رہی تھی تو اِسی دوران اُس کے دونوں بہادر بیٹے خیمے میں داخل ہو گئے انہوں نے دیکھا کہ اُن کی ماں الگ ایک کونے میں رو رہی ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی زوجہ محترمہ شہر بانوؓ جو خود بھی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں تھی ان دونوں لڑکوں کو حضرت زینبؓ کے پاس لے گئی اور اُس سے کہنے لگی کہ اے میری بہن اِن دونوں لڑکوں کو اپنے گلے سے لگا لو یہ ہماری آنکھوں کے تارے عنایت، مہربانی اور انعام کے مستحق ہیں۔ اُنہوں نے ایسا کیا قصور کیا ہے۔ جو آپ اِن سے اس قدر ناراض اور خفا ہیں۔

بند نمبر 10: اس بند میں میر انیسؔ کہتے ہیں جب دونوں بیٹوں عون ومحمدؓ نے اپنی ماں کی گفتگو سنی تو انہوں نے اپنا لباس تبدیل کر کے جسم پر جنگی ہتھیار سجائے اور میدان جنگ کی طرف جانے لگے تو تمام خیموں اور اطراف میں ایک شور بر پا ہوا کہ حضرت امام حسینؓ کی بہن حضرت زینبؓ کے نور نظر میدان میں جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے وہ دونوں بھائی جن کے چہرے آئینے کی طرح صاف تھے، اپنی ماں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے آداب بجالا کر اجازت مانگی تو حضرت زینبؓ کا بے قرار دل سینے میں اور تڑپنے لگا اور روتی ہوئی آنکھوں اور بے قرار دل سے کہا جاؤ میرے بیٹو، دین کے بادشاہ یعنی حضرت امام حسینؓ کے لئے اپنے آپ کو قربان کر لو اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شہید ہو کر سیدھے جنت کی طرف تمہارا سفر ہو گا اور تمہیں یہ سفر مبارک ہو۔

بند نمبر 11: اس بند میں میر انیسؔ کہتے ہیں کہ جانے سے پہلے اپنے بیٹوں کو ماں نصیحت کرتی ہوئی اُن سے فرماتی ہے کہ اے میرے بیٹو! تم دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر انہیں بتا دینا کہ تم نے کس دلیر ماں کا دودھ پیا ہے۔ ایسی دلیری اور بہادری سے جنگ کرنا اور اپنے دادا حضرت جعفر طیار کی طرح تلواروں کے کرتب دکھانا۔ یہی نہیں بلکہ امام حسینؓ جیسا رعب و داب اور امام حسینؓ جیسی شان دشمنوں کو دکھانا اور اُن کا مقابلہ ڈٹ کر کرنا جیسے تمہارے نانا حضرت علیؓ جن کا لقب ید اللہ ہے کیا کرتے تھے بلکہ اُن کی طرح دشمنوں کے جگر اپنے نیزوں سے چھلنی کر ڈالنا اور جس طرح حضرت علیؓ نے خیبر کا دروازہ توڑ کر لایا تھا اُسی طرح تم کوفے شہر کا دروازہ توڑ کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا۔

تشریح ''شہادت حضرت امام حسینؓ''

حوالہ: درج ذیل بند ہماری نصابی کتاب ''بہارستانِ اُردو میں درج مرثیہ ''شہادت حضرت امام حسینؓ'' سے منتخب کیا گیا ہے جو مرزا سلامت علی دبیرؔ کے لکھے ہوئے مرثیہ کا وہ حصہ ہے جس میں حضرتِ امام حسینؓ کی شہادت کو نہایت مؤثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

بند نمبر ۵: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ شمرِ لعین کو حضرت امام حسینؓ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ شاہِ کربلا سے اُن کے نانا یعنی پیارے نبی ﷺ کا نام روشن ہے۔ اے شمر تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت امام حسینؓ پیارے نبی ﷺ کی عزت وحُرمت کے سرپرست ہیں۔ تو اِن کے حلق پر خنجر نہ پھیر۔ کیا تو نہیں دیکھتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ پیاس کی وجہ سے خود ہی شہید ہو رہے ہیں۔ اے شمر کیا تجھے اللہ کا ڈر نہیں ہے۔ کیا تو نہیں جانتا ہے کہ تجھے بھی مرنا ہے اور اللہ کے دربار میں قیامت کے دن حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یاد رکھ کہ اُس دن اللہ تعالیٰ تجھے اس کی سزا ضرور دیں گے۔ خدا کے لئے میرے خاندان کو اس طرح بُربادمت کر۔ اے شمر تو حضرت امام حسینؓ کے ننھے اور معصوم بچوں پر رحم کر اور حضرت امام حسینؓ کو چھوڑ دے۔

بند نمبر ۶: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ جب حضرت امام حسینؓ کی بہن جناب زینبؓ نے اپنے بھائی کے شہید ہونے کی خبر سُنی تو وہ اپنے خیمے سے نکل کر میدانِ کربلا کی طرف چلاتے ہوئے بے پروا دوڑتے ہوئے کہنے لگی کہ اے میرے بھائی ہماری ماں جناب حضرت فاطمہؓ اپنے روضہ سے نکل کر میدانِ کربلا میں آئیں ہیں تو میں بھی ننگے پیروں سمیت میدانِ کربلا میں آجاتی ہوں۔ حضرت امام حسینؓ کی بیٹی جناب سکینہؓ نے کہا کہ میں بھی میدانِ کربلا میں آکر یزیدی فوج کے ظلم کا خنجر روک لیتی ہوں۔ حضرت امام حسینؓ کے پوتے جناب باقرؓ نے کہا کہ اے شاہِ کربلا میں آپ پر سو جان سے فدا ہو جاوں۔ شاید شمر لعین کو میری معصومیت پر رحم آئے اور وہ ظلم کا خنجر روک لے۔ اے میرے دادا میں میدانِ کربلا میں آکر آپ کے گلے پر اپنا گلا رکھ دوں گا۔

بند نمبر ۹: اس بند میں شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے دبیرؔ اپنے قلم کو روک لو کیونکہ فرشتے آج ماتم کر رہے ہیں۔ حضرت

جبرائیلؑ زور وشور سے آواز دے رہے ہیں۔تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج مشرقین کے بادشاہ حضرت امام حسینؑ شہید ہو گئے۔آج اہلِ بیعت یتیم ہو گئے کیونکہ آج حضرت امام حسینؑ شہید کر دئے گئے ہیں۔ یہ حضرت علیؑ کا خاندان ہے جو آج اُجڑ گیا۔اس اجنبی شہر یعنی میدانِ کربلا میں حضرت زینبؓ اپنے بھائی حضرت امام حسینؑ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئی۔

خلاصۂ مرثیہ :

مرثیہ ''حضرتِ امام حُسینؑ کی شہادت'' مرزا دبیرؔ کا لکھا ہوا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جب امام حُسینؑ پر یزیدی فوج نے نیزوں کی بارش کر دی تو آسمان پر فرشتے ماتم کرنے لگے اور عرش لرزنے لگا۔امامؑ غش کھا کر زمین پر گر پڑے تو دشمنوں نے اور زیادہ ان پر حملے تیز کر دیئے۔شمر نام کا سپاہی ظلم اور ستم کی انتہا پر اُتر آیا اس نے حضرت امام حُسینؑ کے سینے پر پاؤں رکھ کر ان کا گلا کاٹنے کی کوشش کی تو امامؑ کے والدین علیؓ و فاطمہؓ قبر سے تڑپتے ہوئے نکلے اور شمر کو پیغمبرﷺ کی رسالت اور خدا کی عدالت کا واسطہ دینے لگے تا کہ وہ یہ غضب کرنے سے باز رہے۔دوسری طرف امامؑ کی بہن حضرت زینبؓ اور ان کی بیٹی سکینہ تڑپ تڑپ کر شمر کو باز رکھنے کی کوششیں کرتی رہیں۔امامؑ شمر کے خنجر کے سائے میں بار بار اپنی بہن حضرت زینبؓ کی طرف دیکھ کر یہ کہتے رہے کہ وہ بچوں کو لے کر خیمے میں بیٹھی رہے تا کہ امامؑ کی توجہ ان آخری لمحوں میں بھی خدا کی طرف رہے۔جوں ہی زینبؓ امام حسینؑ کے بچوں کو لے کر خیمے میں داخل ہو گئی تو یہاں شمر نے امام حُسینؑ کی گردن پر خنجر چلا دیا۔شمر نے امامؑ کا سرِ مبارک کاٹ کر نیزے پر رکھ دیا اور امامؑ کا باقی جسمِ مبارک زمین پر تڑپنے لگا۔یہ قہر برپا کر کے عمر و نام کے سپاہی نے خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ڈھول بجوا دیئے اور امامؑ کا سرِ مبارک نیزے پر خدا کی بڑائی بیان کرنے کیلئے بار بار تکبیریں کہتا رہا۔ اس طرح پیغمبرِ اسلامﷺ کے نواسے اور حضرتِ فاطمہؓ کے لختِ جگر نے کربلا کے میدان میں اسلام کی سربلندی کیلئے شہادت پیش کی۔

محاکمہ:

مرثیہ ہماری شاعری کی وہ صنف ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔اس نے اردو شاعری کو نت نئے موضوعات عطا کیے اور وہ شاعری جس پر تنگ دامانی کی تہمت تھی موضوعات کی بے پناہ وسعت سے مالا مال ہوئی۔حادثۂ کربلا پر بے شک پہلے عربی اور پھر فارسی زبان میں مرثیے کہے گئے لیکن وہ اردو مرثیے کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے اور دنیا کی کسی اور زبان میں تو اس موضوع پر اور ایسے فن کارانہ مرثیے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔مرثیہ میں واقعاتِ کربلا،حضرت امام حسینؑ اور ان کے اقرباء ورفقاء کے مصائب،ان کی شہادت کا بیان، بلکہ سفر کربلا سے پہلے کے حالات اور شہادت کے بعد کے واقعات بھی شامل ہیں۔مرثیہ نگاری سے اُردو ادب کو بے حد فائدہ پہنچا۔اس کے وسیلے سے اُردو شاعری میں لاتعداد مضامین داخل ہو گئے۔صدہا واقعات کے علاوہ ہمارے مرثیہ نگاروں نے بے شمار کردار بھی پیش کیے ہیں۔مرثیہ نگاری سے اُردو کا دامن وسیع ہوا اور اس کے سرمایے میں الفاظ کی ایک بہت بڑے ذخیرے کا اضافہ ہوا۔مرثیے کا دورِ عروج میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کا دور ہے۔یہ اُردو مرثیے کے شہنشاہ ہیں جنھوں نے اُردو مرثیے کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ انیسؔ و دبیرؔ ایک ہی عہد کے شاعر ہوتے ہوئے بھی لسانی،فنی،شعری اور فکری سطح پر ایک دوسرے سے بہت ہی الگ دکھائی دیتے ہیں۔دونوں نے اس صنفِ ادب کو بے پناہ مقبولیت سے ہمکنار کیا۔

اس اکائی میں مرثیہ کی تعریف،اقسام، اجزاء اور تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے سوانحی کوائف اور شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ نصاب میں شامل دونوں مرثیوں کی تفہیم پیش کی گئی۔

جانچ:

۱۔ مرثیہ کے اقسام تحریر کیجئے۔

۲۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔

۳۔ اُردو کے مشہور مرثیہ نگاروں کے نام تحریر کیجئے۔

۴۔ میر انیس کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجئے۔

۵۔ حضرت زینبؓ اپنے بیٹوں حضرت عون ومحمدؓ سے کیوں خفا تھیں؟

۶۔ چوتھے بند کے آخری مصرعے میں کونسی صنعت استعمال ہوئی اور کیسے

۷۔ حضرت امام حسینؑ کی لاش زمین پر گرنے کے بعد یزیدی فوج نے اس کے ساتھ کیا کیا؟

۸۔ شمرِ لعین نے کیا کیا؟

۹۔ مرثیہ میں فاطمہ زہراؓ کے کلمات بیان کئے گئے ہیں۔اُن کو نثر میں لکھئے۔

۱۰۔ دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

۱۱۔ دبیرؔ کے حالاتِ زندگی کی وضاحت کیجئے

معاون کتب:

۱۔	موازنۂ انیس و دبیرؔ	علامہ شبلی نعمانی
۲۔	اُردو مرثیہ	اظہر فاروقی
۳۔	مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی
۴۔	تعارف مرثیہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۵۔	انیس شناسی	پروفیسر گوپی چند نارنگ
۶۔	مرزا سلامت علی دبیر	پروفیسر محمد زماں آزردہ
۷۔	مراثی دبیر	اکبر حیدری

شکریہ